ہفت روزہ
الفتح
کراچی

اشاعتِ خاص ستمبر ۱۹۷۲ء

۳۱ اگست — ۷ ستمبر ۱۹۷۲ء



قیمت — ایک روپیہ ۲۵ پیسے
ہوائی ڈاک سے:- ڈیڑھ روپیہ

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد ۔ ۳ ، شمارہ ۔ ۱۶

۳۱ اگست ۔ ۷ ستمبر ۱۹۷۲ء

نگران
شوکت صدیقی

مدیر
ارشاد راؤ

نائب مدیر
وہاب صدیقی

سرورق :۔ جمشید انصاری

اشاعتِ خاص

قیمت :۔ ایک روپیہ پچیس پیسے
ہوائی ڈاک سے :۔ ایک روپیہ پچاس پیسے

مقام اشاعت
ہفت روزہ الفتح ، ۷ ڈی نرسری کمرشل ایریا
پی ۔ ای ۔ سی ۔ ایچ ۔ ایس ۔ کراچی ، ۲۹

ایڈیٹر پبلشر :۔ ارشاد راؤ

مطبع حقانی آفسٹ پریس لیاقت آباد کراچی

ٹیلیفون :۔ ۴۱۲۲۷۴

اداریہ

خون پھر خون ہے ....

یہ بلوچستان کا خونی میدان ہے ۔ جھل جاؤ ہے ۔ کوہلواہ ہے ۔ نال ہے ۔ مشکے ہے یہاں کاشتکاروں کے خون سے ہولی کھیلی گئی ہے ۔ جھل جاؤ میں کڑیل جوانوں کے ساتھ چار معصوم بچوں نے دم توڑ دیا ہے ۔ اُن کا خون جھل جاؤ کی زمین پر اہل وطن کو پکار رہا ہے ۔

دیکھو ! سرداروں نے خون کی ندیاں بہا دی ہیں ۔ دیکھو ، یہ وہ حکمران ہیں جو سندھ میں فسادات پر ٹسوے بہا رہے تھے ۔

کہاں ہیں ، کراچی کی فرنٹیئر اور پٹھان کالونی میں نیپ کی مزدور دوستی جمہوریت اور آزادی کے راگ الاپنے والے ———— !

کہاں ہیں ، مزدوروں اور کسانوں کے راج کے علمبردار ———— !

کہاں ہیں ، نیپ کے گن گانے والے ———— !

کہاں ہیں ، مفتی اور ولی کے پرستار ———— !

انہیں یہ خون کی ندیاں دکھا دو ۔ ان کے ضمیر بیدار ہیں تو وہ کیوں نہیں نہتے بلوچ کاشت کاروں پر فائرنگ ، اندھا دھند گرفتاریوں اور ظلم و تشدد کی مذمت کرتے ۔

اب اُن کی زبان پر کیوں تالے پڑ گئے ہیں ۔ وہ سرحد میں کسانوں پر ہونے والے مظالم کی خونچکاں داستان پٹھان کالونی ، فرنٹیئر کالونی ، منگھوپیر ، لانڈھی اور سندھ اور پنجاب کے عوام تک کیوں نہیں پہنچاتے ۔ کیا وہ بتا سکیں گے کہ مفتی جس مظلوم پر فائرنگ کرے ، وہ حلال اور ممتاز جو فائرنگ کرے وہ حرام ؟ نیپ کے مفتی سوشلزم ، روس اور بھارت کے دوستوں کے پاس اس کا جواب نہیں بن پڑے گا ۔

حقیقت یہ ہے کہ نیپ بلوچستان اور سرحد میں ایک ننگا ناچ پیش کر رہی

باقی صفحہ ۶ پر ملاحظہ فرمائیں



جہدِ مسلسل عملِ پیہم

آج ہماری ملکی معیشت کو زبردست چیلنج کا سامنا ہے۔ یہ وقت لیت و لعل کا نہیں اور نہ ہی یہ سوچنے کا ہے کہ حکومت ہمارے لئے کیا کر سکتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم ملک کی خاطر کیا قربانیاں دے سکتے ہیں۔

آیئے ہم اپنا محاسب کریں۔ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں۔ اور اقتصادی محاذ پر اپنے تمام وسائل بروئے کار لاکر پیداوار میں اضافہ کریں۔ برآمدات کو فروغ دیں۔ اور زیادہ سے زیادہ بچت کریں۔ ہم سب کو اپنے فرائض سے بڑھ کر کام کرکے اپنے مسائل حل کرنے ہونگے۔ مستحکم۔ طاقتور اور خوشحال پاکستان کی تعمیر کے لئے ہمیں ایک زندہ قوم کے زندہ افراد کی طرح جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم کی ضرورت ہے۔

حبیب بینک لمیٹڈ

اندرا پھنس گئی ہے، چین نے بھرپور وار کیا ہے

چین کا ویٹو — پاکستان اور مضبوط ہو گیا

واقفِ حال

پاکستان کا سرکاری وفد آجکل دہلی میں ہے۔ **چین** کے نائب وزیر خارجہ اپنے ایک وفد کیساتھ اسلام آباد میں آئے ہوئے ہیں۔

کچھ معلوم نہیں کہ بھارت کا کوئی وفد ان دنوں بیجنگ کی راہ لے۔ چین کے ویٹو نے بین الاقوامی صورتِ حال تبدیل کر دی ہے۔ سیاسی مبصرین اپنے اپنے زاویہ کے مطابق اسکی تاویلیں کر رہے ہیں۔ میرے نزدیک صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان اصولی طور پر بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے لئے ذہناً تیار تھا۔ اگر بھارت یہ کہتا ہے کہ مذاکراتِ شملہ کے دوران صدر بھٹو نے یہ یقین دلایا تھا کہ ۱۴ اگست تک بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا جائے گا، یہ بات کسی حد تک درست ہے کیونکہ صدر نے مری میں معاہدہ شملہ کے لئے جانے سے پہلے دانشوروں اور صحافیوں کو یہ بتایا تھا کہ قومی اسمبلی کے ۱۴ اگست کے ہونیوالے اجلاس میں بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے مسئلے پر غور کیا جائے گا۔ قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کی اکثریت ہے۔ اس لئے اسے تسلیم کرنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ لیکن اسکے ساتھ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس اجلاس سے پہلے شیخ مجیب الرحمان سے بات چیت ضروری ہے، تاکہ بہت سے معاملات پہلے سے طے ہو جائیں۔ پاکستان کی طرف سے تو مسئلہ کانفرنس کے دوران بھی یہ پیشکش کی گئی تھی کہ شیخ مجیب الرحمان یہاں گفتگو میں شامل ہو جائیں تو بات چیت میں آسانی پیدا ہو گی۔ کیونکہ بنگلہ دیش مذاکراتِ شملہ کا بہرحال ایک لازمی جزو تھا۔ اس کے بغیر بات بار بار اٹکتی تھی۔ اگر مسائل کو خلوصِ دل سے اور واقعتہً حل کرنا مقصود تھا تو اس میں بنگلہ دیش کی شمولیت سود مند ہو سکتی تھی۔ مگر بنگلہ دیش کے وزیرِ اعظم شیخ مجیب الرحمان اپنی طالب علمانہ قیادت سے آگے جانیکو تیار نہیں ہیں۔ وہ ہر مرتبہ "بنگلہ دیش تسلیم کرو" کی پابندی لگاتے ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو یہ علم ہے کہ ایک بار بنگلہ دیش تسلیم



بھٹو، مجیب کے

اعصاب پر

سوار ہیں

ہو گیا تو پھر اپنی بات منوانے کی آسانی رہے گی۔ اگر پاکستان سیدھی طرح بات نہیں مانے گا تو اس پر اقوام متحدہ کا دباؤ ڈالا جا سکے گا۔ اسی لئے شیخ مجیب الرحمان ملاقات سے انکار کرتے رہے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو سفارتی مذاکرات اور میز کی گفتگو کے ماہر ہیں۔ اس میں شیخ مجیب الرحمان مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسلئے وہ ہر بار ملنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ...... رہائی سے پہلے بھی انھوں نے یقین دلایا تھا کہ وہ بنگلہ دیش واپس جا کر کچھ دنوں بعد ملاقات کا وقت طے کر لیں گے۔ پھر کچھ باہمی رازداروں کے ذریعے تبادلہ خیال بھی ہوا۔ تیسری طاقتوں کے ذریعے بات چیت بھی ہوئی۔ سب سے آخری دعدہ ملاقات قاہرہ میں ۱۵ جولائی کے لئے ہوا۔ یہ تاریخ مقرر کی جا چکی تھی۔ اس کیلئے مصر نے خاصا اہم کردار ادا کیا۔ سپریم اسلامک کونسل مصر کے چیئرمین توفیق العدیدہ بنگلہ دیش میں شیخ مجیب الرحمان سے مل کر آئے تھے۔ یہی پاکستان میں صدر بھٹو سے ملے۔ یہ معاملہ اس حد تک یقینی تھا کہ اس کے سہارے قومی اسمبلی کے اجلاس میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مسئلہ پیش کیا جانے والا تھا۔ مگر عین اس وقت پر شیخ مجیب الرحمٰن نے ملنے سے انکار کر دیا۔ جن دنوں صدر بھٹو سندھ کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے کراچی آئے ہوئے تھے۔ انہی دنوں شیخ مجیب الرحمان کا یہ پیغام ملا۔ اس سے صورتِ حال ساری بدل گئی تھی۔ قومی اسمبلی نے معاہدہ شملہ کی توثیق کر دی تھی۔ حالات ایک حد تک ٹھیک سمت میں آگے بڑھ رہے تھے۔

کچھ دنوں بعد فرانس پریس نے خبر دی کہ چین بنگلہ دیش کی اقوام متحدہ میں رکنیت کے لئے درخواست کو ویٹو کر دے گا۔ اس کی تصدیق چین کے مختلف سفارتخانوں نے کر دی۔ اور پھر صدر بھٹو نے پریس کانفرنس میں ڈرامائی طور پر اعلان کر دیا۔ کہ چین بنگلہ دیش کو ویٹو کر دے گا۔ اسی عرصے میں اصل حالات کا علم ہمارے مرکزی وزراء کو بھی

نہیں تھا۔ عین ان دنوں جب صدر بھٹو یہ فیصلہ کر چکے تھے اور کچھ اخبار نویسوں کو اعتماد میں لیتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ قومی اسمبلی ۱۴ اگست کے اجلاس میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنیکے مسئلہ پر غور نہیں کرے گی۔ انہی دنوں مرکزی وزیرِ اطلاعات مولانا کوثر نیازی ایک جلسۂ عام میں کہہ رہے تھے کہ قومی اسمبلی کا اجلاس بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے مسئلے پر غور کرے گا۔ مولانا کے اس بیان اور دوسرے وزیروں کے بیان سے یہ تاثر لیا گیا کہ پاکستان کی حکومت تو آخر وقت تک بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے لئے بے چین تھی۔ مگر چین نے اپنے طور پر ویٹو کی دھمکی دے کر پاکستان کو مصیبت میں ڈال دیا۔ حالانکہ اس بار بھی چین نے پاکستان کی مدد کی ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے ملاقات سے انکار روس کے حکم پر کیا ہے۔ ایسے حالات میں پاکستان کے لئے سفارتی طور پر کچھ بڑی سرگرمی دکھانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ اس لئے صلاح مشورہ کیا گیا اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ چین جیسی عظیم طاقت جو ۲۲ سال تک اقوام متحدہ کی رکنیت سے محروم رہی۔ اور جو ہر بات میں صداقت اور اصول پرستی کی ایک مثال قائم کئے ہوئے ہے۔ اقوام متحدہ میں اس کی موجودگی میں کوئی غلط کارروائی نہ ہونے پائے۔ چین نے ویٹو کا استعمال اسی اصول پرستی کی روایت قائم کرنے کے لئے کیا ہے کہ جو ملک ابھی تک بھارت اور روس کے نرغے سے نہیں نکلا اور جو اقوام متحدہ کی منظور کردہ قراردادوں کو عمل درآمد کے قابل نہیں سمجھتا۔ اس کو اقوام متحدہ کی رکنیت کیوں دی جائے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ چین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ یہ نوزائیدہ ملک اپنی بنیاد اصولوں اور انسان دوستی پر رکھے۔ اور جن طاقتوں کی شہ پر وہ پاکستان سے ناانصافی کر رہا ہے، اور دراصل اپنے عوام پر ظلم کر رہا ہے، اسے احساس ہو جائے کہ اقوام متحدہ میں دوسری طاقتوں کو بھی کچھ اختیارات حاصل ہیں۔ اور جب چین اقوام متحدہ میں موجود ہے تو اس کے ہوتے ہوئے کوئی ناانصافی نہیں کی جا سکتی۔

بھارت کے لئے یقیناً ایک بوکھلاہٹ پیدا ہو گئی ہے۔ کیونکہ معاہدہ شملہ کی وجہ سے ہندوستان میں بھی اندرا گاندھی کے خلاف رائے عامہ پیدا ہوئی ہے۔ چین کے ویٹو نے اندرا حکومت کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کر دی ہے۔ اس لئے حکومتِ ہند کیلئے اپنے عوام کے سامنے جواب دہی مشکل ہو گئی ہے۔ اس لئے اب وہ مختلف قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہے۔ اب اس نے جنگی قیدی واپس کرنے پر بات کرنے سے انکار کیا ہے۔ دوسری سربراہ کانفرنس میں تاخیر ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود پاکستان کی پوزیشن مضبوط ہے۔ کیونکہ اسکی طرف سے معاہدہ شملہ کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنیکی زبانی یقین دہانی کا پورا نہ ہونا بالکل ویسا ہی ہے جیسے شیخ مجیب الرحمان کو ملاقات کے لئے تیار کرنے کی بھارت کی یقین دہانی کا پورا نہ ہونا۔

اہلِ پاکستان کو یہ احساس ہونا چاہیئے کہ شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات بنگلہ دیش تسلیم کرنے سے پہلے بہت ضروری ہے کیوں کہ ایسے بہت سے امور اور تنازعات ہیں جو شیخ مجیب الرحمٰن سے پہلے طے ہونے ضروری ہیں۔ ورنہ بعد میں بہت بڑا گھپلا ہو جائے گا۔ صورتِ حال بالکل وہی ہے جو جنوری ۱۹۷۱ء سے مارچ ۱۹۷۱ء تک تھی۔ اگر اس وقت مسٹر بھٹو بات چیت کیے بغیر قومی اسمبلی میں چلے جاتے تو شیخ مجیب الرحمٰن قانونی طور پر وزیر اعظم بن کر پی۔ آئی۔ اے، سٹیٹ بنک، ریزرو سرمایہ، دار الحکومت، سب کچھ ڈھاکہ لے جاتے۔ اور اس کے بعد آئینی طور پر مشرقی پاکستان کی آزادی کا اعلان کر دیتے۔ اس وقت کوئی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ پاکستان اور بالخصوص مغربی پاکستان کا دیوالیہ نکل جاتا۔ اب بھی صورتِ حال یہی ہے ملاقات سے پہلے اگر بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا گیا تو شیخ مجیب صاحب انہی اثاثوں پر اپنا حق جمانے کیلئے اقوام متحدہ میں پہنچ جائینگے روس بھارت اور دوسرے ممالک ان اثاثوں کو دلوانے کے لئے بھرپور دباؤ ڈالیں گے۔ پاکستان کے لئے اسوقت پوزیشن بڑی خراب ہو گی۔ اس لئے مجیب سے ملاقات انہی معاملات کو طے کرنے کے لئے ضروری ہے۔ ملاقات کے لئے مجیب پر دباؤ ڈالنے کے لئے چین نے بنگلہ دیش کی رکنیت کی درخواست کو ویٹو کیا ہے۔

بقیہ : اداریہ

ہے۔ وہ وقت کی رفتار کے ساتھ خود بھی ننگے ہو رہے ہیں۔ ان کی انقلابی پالیسیاں ان کا ہی منہ چڑا رہی ہیں۔

عوام جان گئے ہیں کہ انتخابات مسائل کا حل نہیں ظلم ملک کے کسی بھی حصے میں ہو اُس کا خاتمہ صرف اور صرف مسلح جدوجہد پر یقین رکھنے والی انقلابی جماعت ہی دے سکتی ہے۔

پارلیمان عوام کے مسائل کا حل نہیں۔

انتخابات عوام کی مشکلات کا حل نہیں۔

سندھ پر کیا گزری؟







پیپلز پارٹی — انتہا پسند سندھی — مہاجر ذہنیت

لسانی بل پیش نہ ہوتا تو "آزاد سندھ" کے قیام کا اعلان کر دیا جاتا

واقفِ حال

ہمارے ایک دوست اِس بات پر زور دیتے ہیں۔

سندھی نے اردو سیکھی۔

پنجابی نے اردو سیکھی بلکہ اسے اپنی زبان بنالیا۔

پٹھان نے اُردو سیکھی۔

بلوچ نے اُردو سیکھی

لیکن نہ سیکھی تو اردو والوں نے اور کوئی زبان نہ سیکھی۔

یہ ایک حقیقت ہے مگر میں اِس سے اختلاف اِس حد تک کرتا ہوں کہ اُردو والوں نے بھی سندھی زبان سیکھی مگر وہاں جہاں اِس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اندرونِ سندھ رہنے والے اُردو خواں اور اُن کے بچے فر فر سندھی بولتے ہیں۔ سندھی پڑھتے ہیں۔ کیوں؟ وہاں اس کے بغیر گزارہ نہیں ہوسکتا۔ یہ وہاں کی اقتصادی ضرورت ہے۔ یہ بات بنیادی طور پر اقتصادیات کی ہی ہے کراچی اور حیدرآباد میں سندھی سیکھے بغیر بھی پیٹ بھر جاتا ہے۔ اس لئے سندھی سیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ باقی رہی شوق کے تحت زبان سیکھنے کی بات اُردو والوں نے اِس طرح تو اردو بھی نہیں سیکھی۔ اب بھی اہلِ زبان ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کی نسبت دوسرے لوگ صحیح اردو بولتے ہیں، صحیح لکھتے ہیں صحیح پڑھتے ہیں۔

سندھ میں جو کچھ ہوا، اس سے تمام دردمند لوگوں کی گردنیں جھک گئیں۔ ایک بات تو پہلے سے ہم طے کرلیتے ہیں کہ سیاسی طور پر پیپلز پارٹی کی نااہلی بھی ان المناک واقعات کا سبب بنی کہ پیپلز پارٹی اگر پہلے سے منظم ہوتی اور اپنے کارکنوں کو خبردار کردیتی تو بہت سی جگہ لوٹ مار اور قتل وغارت کے واقعات کی روک تھام ہوسکتی تھی۔ کیونکہ حزبِ اختلاف یہ پہلے سے عزم کرچکی تھی کہ پیپلز پارٹی کی ہر کوشش پر لوگوں کے جذبات کو بھڑکانا ہے۔ جس طبقے کے جذبات کا استحصال کیا جاسکے۔ اِس میں گھس کر اِس کو پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف صف آراء کرنا ہے کہ یہ حکومت کسی وقت بھی آرام اور سکون سے کوئی کام نہ کرنے پائے۔

اُدھر اندرونِ سندھ حالات یہ تھے کہ سندھ میں انتہاپسندی اور علیحدگی پسندی کے رجحانات پروان چڑھ رہے تھے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے راجستھان اسٹیشن سے سندھی میں خاص طور پر پاکستان کے لئے پروگرام شروع کئے گئے تھے۔ جس میں سندھیوں کو سندھی نیشنلزم کے لئے ابھارا جارہا تھا۔ سندھیوں کو اُن کے حقوق سے محرومی کا احساس دلایا جارہا تھا۔ سندھی ہاریوں کو وڈیروں کے تشدد کے خلاف ابھارا جارہا تھا۔ سننے والے جانتے ہیں کہ ان پروگراموں کا حملہ کس قدر تیز تھا۔ جی۔ ایم سید اور دوسرے انتہاپسند پورے سندھ میں یہ پروپیگنڈہ کررہے تھے کہ بھٹو سندھی ہونے کے باوجود پنجاب کا نمک حلال کررہا ہے۔ اُس نے سندھ کو پنجاب کے ہاتھ فروخت کردیا ہے۔ یہ زہر رفتہ رفتہ پھیل رہا تھا۔ مجیب کے چھ نکات کی طرح سندھ کے انتہاپسند بھی اِسی طرح نکات پیش کرکے سندھ کی طبقاتی جدوجہد کو علاقائی جدوجہد بنا دینا چاہتے تھے۔ اِنہی دنوں سندھ آزاد مارو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا ۲۷ نکاتی چارٹر تقسیم کیا گیا۔ جو جی۔ ایم۔ سید صاحب کے ۲۷ نکات کا چربہ ہی تھا۔

۲۷ نکات

یہ نکات ملاحظہ ہوں۔

(۱) چاروں صوبوں کے باشندگان کو جدا قومیں تسلیم کرکے ان کی حکومتوں کو داخلی خودمختاری دی جائے جس سے سندھ سول سروس اور ملٹری کی سازش سے ڈکٹیٹر شپ قائم

کراچی اور حیدرآباد کے مہاجر، اندرونِ سندھ کے مہاجروں کا خیال کریں

ہونے کے تمام امکانات ختم ہو جائیں گے۔ اِسی بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے مرکزی حکومت کا آئین کنفیڈریشن کی طرز پر بنایا جائے۔

(۲) دفاع، خارجی معاملات، کرنسی اور خرچ سے نمٹنے کے لئے ٹیکس لگانے کے اخراجات کے علاوہ باقی سب محکمے صوبوں کے حوالے کئے جائیں۔

(۳) صوبوں کو ملیشیا قائم کرنے کا اختیار دیا جائے۔

(۴) سندھ کے برآمدی کاروبار کی ایکسچینج کا علیحدہ حساب کتاب رکھ کر صوبہ کا کمایا ہوا غیر ملکی زرِمبادلہ سندھ کو دیا جائے۔

(۵) سندھ سیکرٹریٹ میں سیکرٹری، ڈپٹی سیکرٹری سندھی رکھے جائیں اور سب محکموں کے ہیڈ سندھی رکھے جائیں۔

(۶) کمشنر، ڈپٹی کمشنر، ایس پی، ڈی ایس پی سندھی ہونے چاہئیں۔

(۷) تینوں بیراجوں کی جو زمین فوجیوں اور افسروں کو دی گئی ہیں وہ لے کر سندھی کسانوں میں تقسیم کی جائیں۔

(۸) سندھ میں مزید دو یونی ورسٹیاں خیرپور اور اگریکلچر کالج ٹنڈوجام میں قائم کی جائیں اور چاروں یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر سندھی ہونے چاہئیں۔

(۹) کیونکہ چھوٹے زمینداروں پر لگان معاف کر دیا جائے گا اور بڑا زمیندار رہے گا ہی نہیں۔ اس صورت میں انکم ٹیکس، کسٹمز اور ایکسائز ڈیوٹیز معاوضہ کے طور پر سندھ صوبے کو دی جائیں۔

(۱۰) سرکاری اور نیم سرکاری ادارے مثلاً واپڈا، ریکو، اے ڈی سی پی آئی ڈی سی، پوسٹ ٹیلی گراف، ریڈیو ٹیلیویژن اور انڈسٹریز وغیرہ گورنمنٹ آف سندھ کے حوالے کئے جائیں۔

(۱۱) سندھ صوبے میں پہلے کی طرح ایس پی آرملیشیا خالص سندھیوں پر مشتمل قائم کی جائیں۔

(۱۲) C S P اور P S P پراونشل سروس میں لائے جائیں۔

(۱۳) دریائے سندھ اور دوسری ندیوں کا پانی ۱۹۴۵ء کے معاہدہ کے مطابق سندھ کو دلایا جائے۔

(۱۴) سب کارخانوں، ملوں اور سندھ کے نجی یا سرکاری سروسز میں ۸۰ سندھیوں کے لئے ۸۰ فی صد نشستیں مخصوص کی جائیں۔

(۱۵) زرعی زمینوں کی اصلاح کے ساتھ کارخانے، بینک اور انشورنس کمپنیاں بھی قومیائی جائیں۔

(۱۶) دو لاکھ سے زیادہ شہری جائداد پر سیلنگ کی جائے۔

(۱۷) سندھ اور پاکستان کی سرکاری بولی سندھی ہونی چاہیئے۔

(۱۸) ہر سندھی باشندے کے لئے سندھی بولی کا سیکھنا لازم قرار دیا جائے۔

(۱۹) آبادکاری اور کسٹوڈین کھاتہ ختم کیا جائے۔ جھوٹے کلیموں کے بارے میں تحقیقات کرائی جائے اور جھوٹے کلیم ہولڈروں کو سزائیں دی جائیں۔

(۲۰) مذہبی نظام حکومت کے دھوکے کو ختم کرنے کے لئے پیروں اور ملاؤں کو سیاست سے ڈسفرینچائز کیا جائے۔

(۲۱) زرعی اصلاحات کے بعد جو بھی زمین سرکار کو حاصل ہو وہ اصلی (قدیم) بے زمین "سندھی ہاریوں" میں مُفت تقسیم کی جائے۔

(۲۲) کالجوں میں داخلے کے دوران "خاص سندھیوں" کے لئے ۸۰ فی صد نشستیں مخصوص کرکے بقایا نشستیں اہلیت کی بنیاد پر پُر کی جائیں۔

(۲۳) ریلوے اسٹیشن، راستوں، دفتروں، ریلوے ٹکٹوں اور کرنسی نوٹوں وغیرہ پر سندھی زبان لکھی جائے۔

(۲۴) مرکزی سروسز اور سندھ کو صوبائی نقطہ نگاہ سے ایک چوتھائی حصہ دیا جائے۔

(۲۵) سندھ سے پیسہ باہر جانے پر پابندی لگائی جائے۔

(۲۶) بحریہ۔ فضائیہ اور برّی فوجوں میں سندھ کو صوبائی حیثیت سے ایک چوتھائی حصہ دیا جائے۔

(۲۷) سندھ میں مشرقی بنگال سے مزید مہاجروں کے آنے پر پابندی لگائی جائے۔

آزاد سندھ کا منصوبہ

ان نکات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سندھ کی اقتصادی محرومی کو کیا رخ دیا جا رہا تھا۔ حالانکہ بنگلہ دیش کا حشر سامنے تھا کہ وہاں عوامی تحریک کو جس طرح سبوتاژ کیا گیا، اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں کہ بنگلہ دیش اس وقت روس اور بھارت کے استحصال کا شکار ہے۔ اور عوام اس طرح اقتصادی محرومیوں میں مبتلا ہیں۔ ان تمام حقائق کے باوجود سندھ میں حالات کو یہ رُخ دیا جا رہا تھا۔ سب سے بڑا نقطہ ان انتہا پسندوں کا یہ تھا کہ سندھ کو اس کی مادری زبان سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ سندھی برسوں تک سندھ کی سرکاری زبان رہی ہے، مگر اب اس کو یہ درجہ بھی نہیں دیا جا رہا ہے۔ زبان کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس پر اکثریت کے جذبات کو ہوا دی جا سکتی ہے۔ غریب سندھی ہاری یا مزدور کو عام طور پر عدالتوں، سرکاری دفتروں سے واسطہ پڑتا ہے۔ وہاں اوّل تو انگریزی زبان چلتی ہے، یا اردو۔ اس کو بہرحال پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے اس میں بڑی کشش تھی، کہ اس کی زبان کو سرکاری زبان بنایا جائے، تاکہ اس کے لئے آسانیاں پیدا ہوں۔ اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ اس کے لئے جدوجہد کرے گا۔ کیونکہ یہ اس کی زندگی اور موت کا سوال ہے "جئے سندھ" تحریک کا رخ اسی طرف جا رہا تھا۔ "جئے سندھ" کے نوجوان منظم کئے جا رہے تھے۔ ایک اضطراب اور بے چینی جنم لے رہی تھی۔ انتہا پسند ان رجحانات کو ہوا دے کر "آزاد سندھ" کے نعرے کو عملی شکل دینا چاہتے تھے۔ ایسے میں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ سندھی کو صوبے کی سرکاری زبان بنا دیا جائے۔ تاکہ انتہا پسندوں کے منہ بند ہو جائیں اور قومی یک جہتی کے بند میں جس مقام پر شگاف ڈال کر وہ آزاد سندھ کی راہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا جائے زبان کے مسئلے کو اگر چنگاری کی طرح سلگتے رہنے دیا تو وہ کسی نہ کسی وقت آگ بن کر بھڑک اٹھے گا۔

اردو بولنے والے علاقے

ان حالات میں "لسانی بل" سامنے لایا گیا۔ انتہا پسندوں کی یورش طاقت اور دوررس نتائج کا احساس پیپلز پارٹی کے چیئرمین اور چند دوسرے لوگوں کو جس قدر تھا، وہ سندھ کی صوبائی حکومت کو نہیں تھا۔ سندھ کی صوبائی حکومت اور سندھ کی پیپلز پارٹی اگر حزبِ اختلاف کی طرف سے احتجاج کا اندازہ کر لیتی تو یہ مسئلہ المیہ میں تبدیل نہ ہوتا۔ حزبِ اختلاف نے اس بل، کو پوری طرح استعمال کیا۔ اردو بولنے والے علاقوں میں پیپلز پارٹی کو پہلے ہی کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اردو بولنے والے امیدوار جو پیپلز پارٹی نے نامزد کئے انہیں بھی کامیابی نہ ہوئی، اردو بولنے والے طبقوں کو جماعت اسلامی اور جمعیت العلمائے پاکستان جیسی رجعت پرست اور دقیانوس جماعتوں نے اپنی پناہ میں لیا۔ پیپلز پارٹی کے وڈیروں کو ان کی کیا فکر ہوتی، خود ترقی پسند کارکنوں نے بھی اردو خواں حلقوں کو "ختم اللّٰہ علی قلوبہم" سمجھ کر ان علاقوں میں کام ہی نہیں کیا۔ کراچی کی مثال لے لیں ناظم آباد میں پیپلز پارٹی کا قومی اسمبلی میں کوئی امیدوار ہی نہیں تھا، صوبائی اسمبلی کے لئے ایک کمزور امیدوار صغریٰ فاطمہ تھیں۔ جن کا کام کرنے کے لئے نہ کارکن دیئے گئے نہ مالی امداد لیاقت آباد میں انتہائی بدلی سے مجتبیٰ فاروقی قومی اسمبلی کے لئے نامزد کئے گئے۔ پارٹی کی ہائی کمان نے ان کی کوئی مدد نہ کی۔ پھر بھی وہ ۱۵ ہزار ووٹ لے گئے۔ صوبائی اسمبلی کیلئے

کراچی اور پنجاب کے اخبارات نے مبالغہ آمیز کہانیاں شائع کیں

ان کے بھائی عزیز فاروقی کا بھی یہی حال رہا۔ سوسائٹی کے علاقے میں کمال اظفر نے بہت تاخیر سے کام کیا۔ ڈرگ کالونی لانڈھی کورنگی میں ریٹائرڈ میجر جنرل اکبر خان بھی موزوں امیدوار نہ تھے۔ ان کے ساتھ پنڈی سازش، لیاقت علی کے قتل اور احمدیت کی بدنامیاں وابستہ کردی گئیں۔ صوبائی اسمبلی کیلئے این۔ ڈی خان اور میاں رفیق احمد تھے۔ این۔ ڈی خان کمزور امیدوار تھے۔ میاں رفیق احمد کو پارٹی ہائی کمان نے سبوتاژ کیا۔ اس طرح کراچی کے اردو بولنے والے حلقوں میں پیپلز پارٹی بازی ہار گئی۔ حیدرآباد میں بھی یہی حال رہا۔ اگر پیپلز پارٹی نے ان علاقوں میں کام نہیں کیا تو خود اردو بولنے والوں کی ذہنیت بھی آڑے آئی۔ اردو بولنے والے اپنے آپ کو سب سے مقدس اور سب سے اعلیٰ تصور کرتے ہیں۔ پاکستان کے معمار وہ صرف اپنے آپ کو کہتے ہیں۔ انہوں نے شعوری طور پر اپنے آپ کو مقامی آبادی، تمدن، تہذیب سے الگ رکھا۔ پیپلز پارٹی کی قیادت غیر مہاجر تھی۔ اس لئے اس کے قریب نہ آئے۔ اس نے اردو بولنے والے بھی نامزد کئے تو انہیں منتخب نہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیاسی طور پر وہ سوادِ اعظم سے ہمیشہ کٹے رہے۔ ایوب خاں کے دور میں کراچی کے مہاجر مادرِ ملت کا ساتھ دے رہے تھے۔ اور ڈھاکہ کے مہاجر

ہمارے لئے مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ اور خاص طور پر ان مہاجرین کے لئے جو سندھ کے اندرونی علاقوں میں جاگزیں ہیں۔ مگر انھوں نے ان علاقوں میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ہمیشہ اشتعال پھیلایا۔ اپنے آپ کو یہاں محفوظ سمجھتے ہوئے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے آواز بلند کی۔ اور اس کا ردِ عمل اندرونِ سندھ ہمیشہ ان کے لئے خطرناک ثابت ہوا۔

حالیہ واقعات

لسانی بل کو سندھ میں حزبِ اختلاف نے نقطۂ آغاز بنانے کے لئے کراچی اور حیدرآباد میں ہنگامے شروع کئے۔ کراچی کے اخبارات بالخصوص "روزنامہ جنگ" نے جنون اور دیوانگی پھیلانے میں انتہاؤں کو چھو لیا۔ ۴۸ بار... "اردو کا جنازہ ہے۔ ذرا دھوم سے نکلے" کی پٹی شائع کی۔ لیاقت آباد، ناظم آباد کے غریب عوام کو سڑکوں گلیوں میں نکلنے پر مجبور کر دیا یہ ۷ر جولائی کی بات ہے۔ ۷ر جولائی سے ایک ہفتے تک یہ حالات چلتے رہے۔ مہاجرین کے لیڈروں نے یہ اندازہ بھی نہ کیا کہ سندھیوں میں حزبِ اختلاف سے تعلق رکھنے والے ارکانِ اسمبلی نے بھی بل میں ساتھ دیا ہے، پھر مقامی آبادی میں انھیں کون سا ہمدرد مل سکتا ہے۔

اگر یہ عالم ہے تو پیر پگاڑو کیا کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سندھ میں آج تک جتنے فسادات ہوئے ان کا سرچشمہ کراچی کے واقعات رہے ہیں۔ کراچی کے رہنماؤں نے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہوئے مختلف نعرے بلند کیے، احتجاج کیا، توڑ پھوڑ کی۔ کراچی میں مقامی آبادی اتنی نہیں ہے۔ اس لئے یہاں کبھی یہ تصادم آبادی کے دو حلقوں کے درمیان نہیں ہوتا بلکہ شہریوں کا، پولیس یا فوج سے تصادم ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ لہر حیدرآباد پہنچتی ہے۔ حیدرآباد میں بھی مہاجر اکثریت میں ہیں۔ یہاں یہ تصادم مہاجر مقامی کا فساد ہو جاتا ہے۔ جب دیہات اور قصبوں تک یہ لہر پہنچتی ہے تو یہ مہاجر مقامی فسادات کا رُخ اختیار کر لیتا ہے۔ سندھی وڈیرے اپنی جاگیروں سے کرائے کے آدمی بھیجتے ہیں، مہاجروں کے معزز افراد حقہ کی نالی منہ میں دبائے اپنے دیوان سے بیٹھے بیٹھے اپنے آدمیوں کو چاقوؤں سے مسلح بھیجتے ہیں۔

کراچی میں ۷ر جولائی سے ہنگامے شروع ہوئے تھے۔ حیدرآباد میں تیسرے روز زیادہ سخت ہنگامے شروع ہوئے دیہات میں بارہ تیرہ جولائی کے بعد ان کا آغاز ہوا۔ سندھ میں جو لوگ گئے یا جو لوگ آئے ہیں' ان کے مطابق سب سے زیادہ گڑبڑ لاڑکانہ میں ہوئی۔

لاڑکانہ کو سوچ سمجھ کر اس لئے منتخب کیا گیا، انتہا پسند سندھی بھی پیپلز پارٹی کے خلاف ہیں اور مہاجروں کے لیڈر بھی سندھ میں جام شورو کے طلبہ پہنچے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایسے نعرے بلند کیے کہ جن کا ردِ عمل لازمی تھا۔ مہاجروں نے منظم ہونا شروع کیا۔ عبدالوحید کٹپر صاحب وزیرِ مواصلات نے یہ سیاسی غلطی کی کہ عین ایسے حالات میں طلبہ کا اجتماع بلا لیا۔ یہ اجتماع امن وامان کے لئے طلب کیا گیا تھا۔ مگر اس اجتماع سے واپسی پر طلبہ نے ہنگامہ شروع کر دیا۔ کراچی میں جو اطلاعات پہنچی تھیں۔ ان کے مطابق تو لاڑکانہ میں مہاجروں کی تمام دکانیں جل گئی تھیں۔ تمام مہاجر وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ مگر صحیح واقعات یہ ہیں کہ صرف چار دکانیں نذرِ آتش ہوئیں۔ ۵۰ کے قریب دکانیں لوٹی گئیں۔ دو رائس مل لٹے۔ اور ہنگاموں سے صرف ایک نوجوان ہلاک ہوا۔ ایک اپنے گھر میں بم پھٹنے سے مر گیا۔

مہاجروں کی ذہنیت میں "ہجرت" ایسی رچ بس گئی ہے کہ انھیں اپنی حفاظت کے لئے "فرار" کے علاوہ کوئی اور

قومی زبان اردو، لکھنؤ، دہلی اور امروہے والی اردو نہیں،

بلکہ سندھی، پنجابی، بلوچ اور پٹھان والی اردو ہوگی

ایوب خان کے ساتھ تھے۔ سیاسی سوچ ان کی کبھی سوادِ اعظم کے ساتھ نہیں رہی۔ ہندوستان میں جو ان کا مخاصمانہ رویہ وہاں کے ہندوؤں کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ یہاں آکر انہوں نے مقامی لوگوں کے خلاف اختیار کیا۔ حالانکہ انہی لوگوں نے ان کو شروع میں پناہ دی ان کو زندگی کی تمام سہولتیں فراہم کیں۔ اور انہیں موقع دیا کہ اپنے پاؤں جما سکیں۔ مختلف ٹکڑیوں میں بٹ کر رہتے تھے۔ موجودہ انتخابات میں صرف لیاقت آباد، ناظم آباد اور حیدرآباد میں چند سیٹیں جیت کر یہ حالات کا اندازہ کرتے کہ ہم سیاسی تنہائی کا شکار ہو رہے ہیں۔ جو کسی وقت بھی

پیر آف پگاڑو جن کا نام لیتے یہ رہنمایان کرام نہیں تھکتے ہیں۔ ان کے گروپ کے ارکان بھی سرکاری بنچوں پر جا بیٹھے تھے۔ اب کہا جاتا ہے کہ پیر پگاڑو نے بڑی مدد کی۔ اور اب ان کے ساتھ مل کر سندھ میں اسلام کے تحفظ کے لئے کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اگر پیر پگاڑو سندھی کو سرکاری زبان بنانے کے حق میں نہیں تھے تو ان کے گروپ کے ارکان اسمبلی نے پیپلز پارٹی کے ارکان کا کیوں ساتھ نہیں دیا۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ پیر پگاڑو کا سندھ میں کوئی سیاسی اثر باقی نہیں رہا کہ کوئی رکنِ اسمبلی میں ان کے ساتھ نہیں ہے۔

پانچویں قومیت کی کوڑی اور نام نہاد ترقی پسند

ذریعہ ہی نظر نہیں آتا۔ اگر پاکستان ان کا وطن ہے۔ لاڑکانہ اس وطن کا ایک شہر ہے۔ وہ یہاں ۲۵ برس سے رہتے ہیں۔ تو وہاں سے بھاگنے کا کیا جواز...... وہیں ٹھہر کر مقابلہ کیوں نہیں کرتے۔ اسی ذہنیت اور عمل سے مقامی لوگ یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوتے ہیں کہ مہاجر ان علاقوں کو اب تک اپنا وطن نہیں سمجھتے۔ فرار میں مہاجر رہنماؤں نے خود زیادہ کردار ادا کیا۔ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں نے مجرمانہ خاموشی اختیار کی اور ان سادہ لوح لوگوں کو ان علاقوں سے بھاگنے سے منع نہ کیا۔

سندھ کے دور افتادہ اضلاع جیکب آباد اور خیر پور میں ایسے کوئی واقعات نہ ہوئے مگر مہاجر پھر بھی اپنے گھر چھوڑ کر حیدر آباد اور کراچی چلے آئے۔ سکھر شہر میں کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ نواب شاہ میں دکانیں جلانے کے واقعات ہوئے۔ یہاں مہاجروں نے بھی ہنگاموں میں نمایاں حصہ لیا۔ ایسا نہیں ہوا کہ مہاجروں کو زیادہ مار پڑی۔ برابر کی لڑائی تھی۔ دادو شہر میں ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ دیہات میں اکا دکا واقعات ہوئے۔ ٹنڈو اللہ یار اور ٹنڈو جام میں سندھی ہلاک ہوئے یہاں مہاجرین اور سابق پنجابی فوجیوں کی اکثریت ہے۔ ٹنڈو جام کے اسٹیشن پر تین سندھی طالب علم ہلاک کئے گئے۔ ٹنڈو اللہ یار میں واقعات ایسے بتلائے جاتے ہیں کہ یہاں اکثریت مہاجروں کی ہے۔ دیہات سے سندھی خریداری کیلئے آتے ہیں۔ ایک روز وہ آئے تو پورے شہر میں ہڑتال نظر آئی۔ اس شہر کے چار دروازے ہیں۔ وہ اس میں گھر کر رہ گئے۔ خوفزدہ ہو کر جمع ہو گئے۔ اسی میں ہنگامہ شروع ہو گیا۔ تین سندھی مارے گئے۔ دو مہاجر۔ میر پور خاص میں کوئی واقعہ نہ ہوا۔ سانگھڑ میں کچھ نہ ہوا۔ زیادہ خطرناک واقعات کراچی اور حیدر آباد میں ہوئے۔ کراچی اور حیدر آباد میں مہاجروں کی اکثریت ہے۔ لطیف آباد میں مہاجروں نے ایک سندھی ایم۔ پی۔ اے کے گھر کا گھیراؤ کیا۔ وہاں فائرنگ ہوئی۔ اس میں پانچ افراد ہلاک ہوئے۔ اس ایم۔ پی۔ اے کے گھر سے کافی اسلحہ بھی برآمد ہوا۔ یہ ایم۔ پی۔ اے اگر لطیف آباد میں اپنی حفاظت اور حمایت اپنے سیاسی عمل سے حاصل کرتے تو انھیں اتنا غیر قانونی اسلحہ جمع کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ ان ہنگاموں کے متعلق کراچی کے اخبارات 'سرحد کے وفد' اور پنجاب کے اخبارات نے جو مبالغہ آمیز کہانیاں چھاپی ہیں۔ ان کا حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ سندھ حکومت نے سنسر نافذ کر کے سب سے بڑی حماقت کی۔ ورنہ وہی واقعات اخبارات میں آتے، جو رونما ہوئے۔ سنسر کی وجہ سے افواہیں پھیلیں۔ اور وہ پنجاب کے اخبارات میں سرخیاں بنکر شائع ہوئیں۔

سندھ حکومت کے ارکان اور پیپلز پارٹی کی تنظیم نے بل پیش کرنے سے پہلے سندھ میں رائے عامہ کو باخبر کرنے کے لئے سیاسی طریق کار اختیار کیا اور نہ ہنگامے شروع ہونیکے بعد صدر بھٹو نے سندھ کا دورہ کیا۔ اس میں اخبارات کی اطلاعات کے مطابق بیورو کریسی نے اکثر جگہ صحیح واقعات سے آگاہ ہونے میں رکاوٹیں ڈالیں۔ بولنے والوں کی طرف سے غلط نمائندے پیش کئے، جنھوں نے "سب ٹھیک ہے" کا نعرہ بلند کیا۔ پھر بھی کچھ لوگوں نے بیورو کریسی کی باڑ کو پھاند کر صدر کو صحیح واقعات پیش کر ہی دیئے۔ صدر کے دورے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حزب اختلاف کا مشن ناکام ہو گیا۔ انہوں نے اندرون سندھ سے آئے ہوئے لوگوں کو اپنے گھروں میں واپس جانے سے منع کیا۔ اب تک لاڑکانہ کے کچھ خاندان کراچی وغیرہ میں رکے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کو روزانہ تقریریں کر کر کے، "برین واشنگ" کی جا رہی ہے۔ گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو صرف اردو خواں لیڈروں کی گرفتاری کی مذمت کی گئی تمام تمام سندھیوں کی گرفتاری حق بجانب قرار دی گئی۔ حزب اختلاف شعوری طور پر کراچی کو صوبہ بنانے کے لئے یہ اختلاف مستحکم کر رہی ہے۔ کچھ نام نہاد ترقی پسند ایک دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ انھوں نے اردو بولنے والوں کو ایک قومیت قرار دیدیا ہے۔ جس کا مطلب کہ اردو بھی علاقائی زبان بن جائے اردو والے جو سندھ، پنجاب، بلوچستان، سرحد میں اطمینان سے رہتے ہیں وہ ایک نئی قومیت سے وابستگی کی وجہ سے وہاں سے بھی دربدر ہوں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ قومیت، قوم، زمین اور وطن سے بنتی ہے۔ زمین۔ تہذیب تمدن ثقافت اور معیشت کو جنم دیتی ہے۔ اگر زمین ہی نہیں ہے تو قومیت کہاں سے پیدا ہو جائے گی۔ زبان کا ایک سائنسی ارتقا ہوتا ہے۔ جس کے ڈانڈے معیشت سے ملتے ہیں۔ چاروں صوبے جغرافیائی رشتوں کے ساتھ ساتھ اقتصادی رشتوں میں منسلک ہیں۔ ضرورت اور رابطے کی زبان اردو ہے۔ مگر یہ لکھنوئی دہلوی امروہوی اردو نہیں ہے بلکہ اسے سندھی، پنجابی، پٹھان اور بلوچ اپنی ضرورت کے مطابق بولتے ہیں۔ اردو ایک نیا لہجہ، نیا رنگ اور نیا ذخیرۂ الفاظ پا رہی ہے۔ اگر خیر پور کے کسی گاؤں میں رہنے والا دہلی کا مہاجر اس لئے سندھی سیکھتا ہے کہ آس پاس کے لوگوں سے لین دین کے لئے اس زبان کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ تو جب یہی زبان اکثریت کی زبان۔ اس زمین کی زبان سرکاری زبان بن جاتی ہے تو کراچی اور حیدر آباد کے مہاجر اسے سیکھنے سے کیوں پہلو بچاتے ہیں۔ یہ اقتصادی ضرورت ہے۔ آہستہ آہستہ اس صوبے میں ایسی زبان جنم لے گی جو سندھی اور اردو کا مرکب ہو گی۔ اس وقت کسی کو کوئی دقت نہ ہو گی۔ یہ قانونِ قدرت ہے، تاریخ کا تقاضا ہے۔ کراچی ایک جزیرہ نہیں ہے۔ اس کی اقتصادی ضروریات سندھ سے اور سندھ کے معاشی تقاضے اس سے وابستہ ہیں۔

کون کیا کر رہا ہے؟

اپنے رہنماؤں کا محاسبہ کیجئے

ہمارا سلسلہ "پاکستان پیپلز پارٹی کی تنظیم، عوام اور کارکن کیا کہتے ہیں؟" انتہائی کامیاب رہا۔ ہم اپنے قارئین اور پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے انتہائی شکر گذار ہیں کہ انہوں نے اپنی سچی اور دلی رائے کا اظہار کر کے الفتح کے صفحات کو وقعت بخشی۔ اب اس کامیاب سلسلے کے اختتام کے بعد ہم قارئین الفتح اور سیاسی کارکنوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ مندرجہ ذیل سوالات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ (۱) موجودہ حکومت کے وزرائے کرام میں کون کیا کردار ادا کر رہا ہے۔ کونسے وزراء، پارٹی منشور کے مطابق ہیں اور کونسے مخالفت کر رہے ہیں۔
(۲) حزب مخالف کے رہنماؤں میں کس کا کردار وطن دوست ہے اور کون وطن دشمنی پر مبنی حرکتیں کر رہے ہیں

لیڈروں کی منڈی میں بازار کے بھاؤ اکثر ادلتے بدلتے رہتے ہیں

اب مجھے رہبروں نے گھیرا ہے

قدرت اللہ شہاب

جس طرح "زیادہ اناج اگاؤ" کی مہم ایک مستقل نعرہ بن گئی ہے۔ اسی طرح رہبر بنو اور رہبر بناؤ کی تحریک بھی ایک ہمہ گیر مشغلے کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ رہبروں کی سب سے مقبول شکل ایم۔ ایل۔ اے ہے۔

سنیاسی جڑی بوٹیوں کی طرح رہبروں کی بھی دو خاص صورتیں ہیں۔ ایک ایم۔ ایل۔ اے بننے سے پہلے۔ اور دوسری ایم۔ ایل۔ اے بننے کے بعد۔ پہلی صورت میں عموماً سفیر پیدا ہوتے ہیں اور دوسری صورت میں وزیر۔ جو رہبر سفارت اور وزارت کی اسامیوں سے بال بال بچ جائیں، انہیں قوم کا غم کھانے اور ڈپٹی کمشنروں کا ہاتھ بٹانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔

قوم کا غم کھانے والے رہبر قوم کا غم بڑی خوش اسلوبی سے کھاتے ہیں۔ اگر یہ غم خوار طبقہ عالمِ وجود میں نہ رہے تو ہماری قوم بہت جلد گنجی ہو جائے۔ لیکن جو رہبر فقط ڈپٹی کمشنروں کا ہاتھ بٹانے پر مامور ہوا کرتے ہیں، ان کی ذات سے چشم ما روشن اور دل ما شاد ہوتے ہیں۔

اسی طرح کے ایک رہبر اس وقت مجھے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوتے ہیں، تو ان کی چال ڈھال اور ان کے سارے انداز پکار پکار کر پوچھتے ہیں۔ کہئیے صاحب، کوئی سنگین واردات تو نہیں ہوئی؟ اگر نہیں ہوئی تو کیوں نہیں ہوئی؟ ضرور ہوئی ہوگی ——— یہ بھی کوئی بات ہے بھلا، کہ ہر روز زنا یا الجبر نہ ہو؟ خون خرابہ نہ ہو؟ مالک اور مزارع کی لڑائی نہ ہو؟ خویش پروری نہ ہو؟ ناانصافی نہ ہو؟ ——— ارے صاحب یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اور ڈنکے کی چوٹ ہو رہا ہے۔ فقط آپ کی اطلاعات کمزور ہیں۔ وہ میز پر مکہ مار کے اعلان کرتے ہیں۔

کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں۔ رہبر صاحب بے حد الجھن میں ہیں۔ اگر ایک قصہ ہو تو کچھ تفصیلات بھی عرض کروں۔ لیکن این خانہ تمام آفتاب است۔ یہاں پر تو قدم قدم پر یہی رونا ہے۔ آہ نہ جانے اس بدنصیب قوم کا کیا انجام ہونے والا ہے۔

جی تو بہت چاہتا ہے کہ بے چاری قوم کے انجام سے پیشتر میں انہیں ان کے چھوٹے بھائی کے انجام کی بشارت دوں، جو لگلے روز چینی کی بلیک مارکٹ کرتا ہوا پکڑا گیا تھا۔ لیکن مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ میں خاموش رہوں۔ یہ رہبر صاحب کئی بار اعلان کر چکے ہیں کہ صوبے کے تین اخبار ان کی مٹھی میں ہیں۔ اور اگر ابھی تک ان میں میرے خلاف کوئی بیان شائع نہیں ہوا، تو یہ محض ان کی نظر التفات کا فیض ہے۔

باتیں کرتے کرتے اچانک دور سے کئی بندوقیں چلنے کی آواز آتی ہے۔ رہبر صاحب اپنی کرسی سے اچھل پڑتے ہیں۔ "آپ نے کچھ سنا؟ یہ مہاجر کالونی میں فائرنگ ہو رہی ہے۔ آج صبح میں نے کئی ٹرک اس طرف جاتے ہوئے دیکھے تھے۔ کئی سال سے غریب مہاجر وہاں امن سے بیٹھے ہیں۔ اب پولیس زبردستی انہیں وہاں سے اٹھا رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں آخر یہ ظلم کب تک جاری رہے گا؟ مجھے اجازت دیجئے میرا وہاں پہنچنا اشد ضروری ہے۔"

میں انہیں اطمینان دلاتا ہوں کہ یہ پولیس کی فائرنگ نہیں، بلکہ رائفل کلب میں بندوق چلانے کی مشق ہو رہی ہے۔ اور اپنا دل ہلکا کرنے کے لئے میں شہری دفاع پر وہ پوری تقریر دہراتا ہوں جو آج میں نے رائفل کلب کی رسمِ افتتاح پر کی تھی۔

میری تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوتا ہے۔ اور جناب رہبر مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یوں بھی یہ حضرات مایوسی کے دائمی مریض ہیں۔ اگر کوئی برقعہ پوش عورت ان کے سامنے بازار میں صحیح سالم گزر جائے تو وہ بے حد مایوس ہو جاتے ہیں، کہ کسی صاحبِ دل نے آگے بڑھ کر اس کا برقعہ کیوں نہیں نوچ ڈالا؟ اگر عورتیں اس طرح امن و امان عزت آبرو سے چلتی پھرتی رہیں، تو جلسوں میں گلا پھاڑ پھاڑ کر قوم کی خدمت کیسے ہوگی؟ اگر ہر روز امن عامہ میں خلل واقع نہ ہو، تو اخباروں میں دھواں دھار بیانات کون چھپوائے گا؟

جاتے جاتے رہبر صاحب اپنی قیمتی ٹوپی جان بوجھ کر میری میز پر بھول جاتے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے، کہ کچھ وقفے کے بعد وہ اپنی ٹوپی لینے کے بہانے دوبارہ تشریف لائیں گے، اور اپنے چھوٹے بھائی کے حق میں میری معلومات میں اضافہ فرمائیں گے، جو لگلے روز چینی کی بلیک مارکٹ کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔

یہ لیڈر ذرا جلالی ٹائپ کے رہبر ہوتے ہیں۔ ان کے برعکس ایک سراپا جمالی رہبر ہیں، جو ملتے ہی پوچھتے ہیں۔ آپ کے تبادلے کی کوئی خبر تو نہیں؟

"جی نہیں میں نے تو کوئی خبر نہیں سنی۔"

"کوئی پرواہ نہیں۔" جمالی رہبر صاحب بڑے اصرار سے میری ڈھارس بندھاتے ہیں۔ "اگر کوئی ایسی ویسی خبر اڑے، تو بلا تامل مجھے بتا دیجئے گا۔ میں لاہور جا کر سارا بندوبست کر دوں گا۔"

مجھے بار بار ان کو یقین دلانا پڑتا ہے، کہ فی الحال میرے تبادلے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ میرے بھائی بندوں پر کوئی مقدمہ نہیں چل رہا۔ میرے بھتیجوں اور بھانجوں پر کوئی آفت نازل نہیں ہوئی ...... لیکن جمالی لیڈر صاحب مصر ہیں، کہ آج نہیں تو کل مجھے اس قسم کے حادثات سے لازمی طور پر دوچار ہونا ہی پڑے گا۔ لہٰذا میری عافیت اسی میں ہے کہ میں ان کی فرمانبرداری، سعادت مندی اور ان کے خلوص پر

مکمل اعتماد رکھوں۔ اس یقین دہانی کے بعد وہ یکایک اپنی جیب سے ایک فہرست برآمد کرتے ہیں۔ اس فہرست میں چند پٹواریوں اور تھانیداروں کے نام درج ہیں، جنھیں رہبر صاحب رفاہ عامہ کے خیال سے کسی اور جگہ تبدیل کرانا چاہتے ہیں۔

"مجھے ذاتی طور پر ان ملازموں سے کوئی پرخاش نہیں" جمالی صاحب فرماتے ہیں "البتہ عوام کی سہولت اور خیر سگالی کا خیال ہے۔ اگر یہ صاحبان تبدیل ہو جائیں تو عوام کے سر سے ایک بہت بڑی بلا ٹل جائے گی"

سرکاری ملازموں کا یہ رد و بدل ان لیڈروں کا محبوب مشغلہ ہے۔ رفاہ عامہ کی آڑ میں دراصل یہ حربہ علاقائی کارندوں پر دھونس قائم رکھنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔ اگر ڈپٹی کمشنر اس قسم کے ہتھکنڈوں سے بے نیاز رہنے کی کوشش کرے، تو بہت جلد اس غریب کا اپنا تبادلہ ہو جاتا ہے۔

لیڈروں کے طبقے میں سب سے مشکل پسند برادری ان

قوم کا غم کھانے والے رہبر قوم کا غم بڑی خوش اسلوبی سے کھاتے ہیں

رہنماؤں کی ہے جو سیاست کی بجگہ خالص مذہبی پیشوائی پر گزارہ کرتے ہیں۔ عید بقر عید کی طرح ان کا کاروبار بھی سال میں فقط ایک یا دو بار چمکتا ہے۔ خاص طور پر محرم کے دنوں میں ان کی کارگزاریاں بہت زور پکڑ لیتی ہیں۔ کہیں جلوس کے راستوں پر تنازعہ ہے۔ کہیں تعزیوں کی لمبائی پر تکرار ہے۔ کسی زمانے میں جب ہولی یا دسہرے کے جلوس مسجدوں کے آگے سے گزرتے تھے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اچھا خاصا میدان کارزار گرم ہو جاتا تھا۔ لیکن آزادی بھی ملی، اور ہندو بھی گئے۔ پھر بھی جلوسوں اور مساجد کا تصادم اسی گرم بازاری سے جاری ہے۔

ظہر کا وقت ہے محرم کا جلوس نکلا ہوا ہے۔ سُنیوں کی مسجد میں معمول سے زیادہ نمازی جمع ہیں۔ جلوس نے جان بوجھ کر اپنی رفتار سست کر دی ہے۔ تاکہ جب اذان کی آواز بلند ہو تو وہ لپک کر مسجد کے سامنے پہنچ جائے۔ ادھر موذن کو انتظار ہے، کہ ادھر جلوس نزدیک آئے تو خدا کے

اسمبلی اور شراب میں ایک مشترکہ نشہ ہے۔ چھٹتی نہیں

بندوں کو نماز کے لئے پکارا جائے......... باہر جلوس اور اندر جماعت دو مخالف فوجوں کی طرح صف آراء ہو جاتے ہیں۔ لیکن عین اس وقت علاقے کا تھانیدار یا مجسٹریٹ دونوں فریقوں کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے نمائندے ڈپٹی کمشنر کے پاس بھیجیں۔ فریقین کے پیشوا اپنے اپنے وفود لے کر بصد تزک و احتشام ڈپٹی کمشنر کے پاس آتے ہیں۔ اب اگر ڈپٹی کمشنر نے سال بھر سے ان رہنماؤں کے ساتھ مربیانہ خیر سگالی کے تعلقات استوار کر رکھے ہیں، تو بہت جلد مصالحت کے آسان آسان راستے نکل آتے ہیں۔ ورنہ اگر بدقسمتی سے "وفود" میں سے کسی صاحب کا راشن ڈپو ان کی بدعنوانیوں کی وجہ سے منسوخ ہو چکا ہے، یا کسی صاحب کو ٹرک چلانے کا لائسنس نہیں ملا، یا کسی صاحب کی دکان کی الاٹمنٹ معرض التوا میں ہے، یا کسی صاحب کے فرزند ارجمند کو ضلع کچہری میں ملازمت نہیں ملی تو......

ایک گاؤں میں اچانک خطرناک قسم کی کشیدگی نمودار ہو گئی۔ مسئلہ زیر تنازعہ یہ تھا، کہ درود و سلام کے دوران میں "یا رسول اللہ" کہنا جائز ہے یا نہیں۔ باہر سے دو مولوی آئے ہوئے تھے۔ ایک کا ارشاد تھا کہ یا رسول اللہ کہنا جائز ہی نہیں بلکہ باعث برکت ہے۔ دوسرے مولوی اسے ناجائز اور بدعت قرار دیتے تھے۔ علمائے کرام کے دائرے سے پھیلتی پھیلتی یہ بحث سارے گاؤں میں سرایت کر گئی۔ اس آڑ میں بہت سی ذاتی رنجشوں، رقابتوں اور مخاصمتوں نے بھی اپنا رنگ دکھایا، اور رفتہ رفتہ گاؤں کے بہت سے لوگ آپس میں برسر پیکار ہو گئے۔ ایک دوسرے کے مویشی چرائے گئے سر پھٹول ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا گاؤں فساد اور بدامنی کے ایک مستقل چکر میں بری طرح پھنس گیا۔ آخر کار دونوں مولویوں کو گرفتار کر کے باہر بھیج دیا گیا، اور جب پوری تفتیش کے بعد اس جھگڑے کا پہاڑ کھودا گیا، تو اس میں سے سیاست کی ایک چھوٹی سی چوہیا برآمد ہوئی۔ گاؤں میں ایک نمبردار صاحب تھے جو کسی زمانے میں صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ تک انھوں نے بڑے ٹھاٹھ سے ممبری کی۔ لیکن ان کے مخالف امیدواروں نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا، کہ انتخاب ناجائز طریقے سے ہوا تھا اس لئے کالعدم قرار دیا جائے۔ مقدمہ منظور ہوا۔ اور ایک دن بیٹھے بٹھائے ایم۔ ایل۔ اے اسمبلی کی رکنیت سے خارج ہو گئے۔ اسمبلی اور شراب میں ایک مشترکہ نشہ یہ ہے کہ چھٹتی نہیں ہے، منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ جن دنوں یہ نمبردار صاحب ایم۔ ایل۔ اے تھے ان کی شان ہی کچھ اور تھی۔ لاہور جاتے تھے تو وزیروں کے دوش بدوش بیٹھتے تھے۔ ضلع کی تقریبوں میں انھیں اگلی صف میں جگہ ملتی تھی۔ تحصیلدار، تھانیدار جب دورے پر آتے تھے تو ان کے گھر کھانا ضرور کھاتے تھے۔ چند پٹواریوں اور ضلع داروں کو بھی انھوں نے اپنے اثر سے تبدیل کرا دیا تھا —— اتنا سارا خون منہ کو لگنے کے بعد جب اسمبلی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا، تو زندگی کے سارے مزے کرکرے ہو گئے۔ اب نہ وزیران کی بات پوچھتے تھے۔ نہ ڈپٹی کمشنر انھیں اپنی دعوتوں میں بلاتا تھا۔ ہاں تحصیلدار اور تھانیدار ان کا کھانا اب بھی کھا لیتے تھے۔ لیکن گھر پر جا کر نہیں بلکہ حسب ضرورت اپنے کیمپوں ہی میں منگوا بھیجتے تھے۔

زندگی کی اس بے کیفی کو ختم کرنے کے لئے سابق ایم۔ ایل۔ اے نے بہت سے نسخے آزمائے۔ لیکن سیاسی وقار کی جو عمارت منہدم ہو چکی تھی، اس کے مینارے کسی صورت دوبارہ بلند نہ ہوتے تھے۔ بہت کچھ سوچ بچار کے بعد آخر انھوں نے اپنے خرچ سے دو متضاد مولویوں کو بلا کر گاؤں میں یہ نیا فساد برپا کر دیا۔ بچارے مولوی صاحبان تو گرفتار ہو گئے لیکن کچھ روز کے لئے نمبردار صاحب کی لیڈری کا بازار بھی خوب گرم ہو گیا۔ پولیس اور مال کے افسر اور مجسٹریٹ صاحبان جو اس ہنگامے کے سلسلے میں وہاں جاتے تھے، وہ سب سابق ایم۔ ایل۔ اے کے ہاں فروکش ہوتے تھے۔ اور حفظ عامہ کے سارے منصوبوں میں انکی رائے بڑی مفید ثابت ہوتی تھی۔

لیڈروں کی منڈی میں بازار کے بھاؤ اکثر اوقات بدلتے رہتے ہیں۔ منڈی غلہ کی ہو یا سیاست کی۔ تجارتی اصول سب جگہ قریباً ایک ہی ہوتے ہیں۔ آج کل بڑی بڑی دوکانوں میں مختلف چیزوں کے لیبل لگانے کا رواج عام ہے۔ یوں بھی حکومت نے قیمتوں پر کنٹرول کرنے کے لئے بہت سے قانون بنا رکھے ہیں۔ لیکن رہنماؤں کی جس جنس سے ڈپٹی کمشنر کا سابقہ پڑتا ہے، اس پر راشن بندی اور پرائس کنٹرول کا کوئی ضابطہ نافذ نہیں ہوتا۔ یہاں پر ڈپٹی کمشنر کو محض اپنی کاروباری فراست اور نظر شناسی سے ہی کام لینا پڑتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ سیاست اور تجارت کی اس کشمکش میں کبھی کبھی بچارے ڈپٹی کمشنر کا اپنا بھی دیوالیہ نکل جاتا ہے۔

معلوماتِ ضروری



تو میرے ساتھ آئے تو ـــــ اے شیخِ محترم
حُوروں کا نِرخ ـــــ دفترِ رضواں سے پُوچھ لیں

کیا داخلہ ـــــ عوام کی خاطر بھی ہے کُھلا؟
یہ مسئلہ تو ـــــ خُلد کے درباں سے پُوچھ لیں

تم نے یہاں ٹھہرنا ہے شبکو ـــــ تو ہم چلیں؟
کیا ہرج ہے اگر ابھی ـــــ مہماں سے پُوچھ لیں

راضی تو ہیں کھِسکنے کو پریاں ـــــ ہمارے ساتھ
واجب مگر یہی ہے ـــــ سُلیماں سے پُوچھ لیں

کیا اپنی آمدن تو ـــــ غریبوں پہ ہے حلال
پہلے یہ بات ـــــ عملۂ سُلطاں سے پُوچھ لیں

سجدہ تو کر ہی دیتا ہے بُت کو ـــــ مگر عدم!
کیا ہرج ہے اگر ذرا ـــــ یزداں سے پُوچھ لیں

سید عبدالحمید عدم



جمیل الدین عالی

غزل

ہوئی امید کہ اب قید فن سے اٹھتی ہے
ایک آگ سی جو مرے تن بدن سے اٹھتی ہے

عجب نہیں کہ بنے انقلاب کا پیغام
دبی دبی سی شکایت سخن سے اٹھتی ہے

وہ میری لاش کے آثار زندگی دیکھو!
لہو کی لہر بیاضِ کفن سے اٹھتی ہے

تضاد ہے کہ نئی زندگی ہے جو کچھ ہے
بس ایک تند ہوا ہے چمن سے اٹھتی ہے

اگر بکھر نہ گئی محفلیں سجا دے گی!
یہ انجمن جو تری انجمن سے اٹھتی ہے!

ایک رپورتاژ

زبان کا زخم

ابراہیم جلیس

بات پرانی ہو چکی ہے لیکن اتنی پرانی بھی نہیں کہ ماضی کے گھورے پر پھینک دی جائے۔ لوگ اب بھی پوچھتے ہیں کہ صدر ذوالفقار علی بھٹو نے راولپنڈی میں لسانی تنازعے کے حل کے لئے نئے اور پرانے سندھیوں کی جو کانفرنس بلائی تھی اس کی روئیداد کیا ہے۔؟ اور کیا میں نے اردو زبان سے واقعی غداری کی ہے۔؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں اپنی کوئی صفائی پیش کرنا نہیں چاہتا کیونکہ میرا ضمیر ہمیشہ صاف رہتا ہے۔ البتہ لسانی کانفرنس کی روئیداد واقعی بڑی دلچسپ ہے۔ اب تک اخباروں میں اس تصویر کا ایک رخ شائع ہوتا رہا ہے۔ تاریخی ریکارڈ کو درست رکھنے کے لئے دوسرا رُخ دیکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔

وہ جمعہ ۷ جولائی ۱۹۷۲ء کا دن تھا۔

بھٹو حکومت سے اپنی دیرینہ دشمنی چکانے کے لئے دشمنانِ بھٹو نے لسانی بل کی آڑ لے کر کراچی میں ہڑتال کی اپیل کی تھی۔

اخبار جنگ میں جو نام نہاد صحافیوں کے ہاتھ میں "اخبار کی پالیسی" ہے انہیں ابتدا ہی سے بھٹو سے خداواسطے کا بیر ہے۔ چنانچہ انہوں نے جیسے اس یوم ہڑتال کے ذریعے ملک میں لسانی فسادات کی آگ بھڑکانے کا پروگرام پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ ۷ جولائی کے اخبار جنگ میں اردو کے نام پر جذبات کو ابھارنے اور حکومت کے خلاف عوام کو مشتعل کرنے کے لئے ہر ممکن مواد اکٹھا کیا گیا تھا۔

حضرت رئیس امروہوی اخبار جنگ میں روزانہ بلا ناغہ لکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بھی روزمرہ کے "روٹین" کے طور پر اردو کا مرثیہ لکھ بھیجا۔ جس کا ٹیپ کا مصرعہ تھا۔

ع۔ اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔

اُدھر رئیس امروہوی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں! اُدھر جنگ کے مدیران انتظامی نے اخبار کے ہر صفحے پر سیاہ ماتمی حاشیے لگائے اور ہر حاشیے میں یہ مصرع تین تین بار لکھوا دیا۔

ع۔ اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔

جمعہ ۷ جولائی کی صبح جب لوگ بستروں سے جاگے۔ اُن کی نظریں سب سے پہلے اخبار جنگ کے ماتمی حاشیوں اور مرثیے پر پڑی تو عام معمولی پڑھا لکھا آدمی تو کجا —— اچھے سمجھ دار اعلیٰ تعلیم یافتہ محبانِ اردو کے بھی دماغ اُلٹ گئے۔ بس پھر کیا تھا۔ مشتعل "محبانِ اردو" گھروں سے نکل پڑے کہ۔

"جنازہ اردو کا نہیں نکلے گا۔"

"جنازہ ممتاز بھٹو کا نکلے گا۔"

"جنازہ تالپور کا نکلے گا۔"

"وغیرہ وغیرہ"

اردو کا جنازہ تو خیر کیا نکلنا تھا۔ جنازے نکلے غریب چھوٹے دکان داروں، پنیروں، کانسٹیبلوں، مستریوں، مزدوروں، اور معصوم راہگیروں کے۔

اردو کا سہاگ تو کیا لٹے گا۔!

سہاگ لٹے تو غریب گھریلو عورتوں کے —— نوبیاہتا دلہنوں کے۔

اردو کے سر سے عوام کا سایہ عاطفت تو کیا اٹھتا ——!

غریبوں کے ننھے ننھے معصوم بچوں کے سر سے باپوں کے سایہ ہائے عاطفت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اٹھ گئے۔

اردو کی کوکھ تو کیا اجڑتی۔! سینکڑوں ماؤں کی بھری پُری گودیاں اجڑ گئیں۔

اخبار جنگ کے مدیران انتظامی اور اردو تحریک کے بانیوں کی انگلی میں ایک پن تک نہیں چبھی —— مگر اُن کی آواز پر لبیک کہنے والے غریبوں کے خاندان اجڑ گئے۔

میں اخبار جنگ کو حزب اختلاف کے بڑے سے بڑے رہنما سے بھی زیادہ بااثر سمجھتا ہوں کیونکہ حزبِ اختلاف کے بڑے سے بڑے رہنما کے ماننے والوں کی تعداد ہزار دو ہزار سے زیادہ نہ ہو گی۔ مگر اخبار جنگ لاکھوں کی تعداد میں چھپتا ہے۔ اخبار جنگ تو گھر گھر میں جاتا ہے۔ اخبار جنگ تو ملک کا بچہ بچہ پڑھتا ہے۔

اخبار جنگ کا عوام کے ذہنوں اور جذبات پر جتنا اثر ہوتا ہے۔ اتنا ریڈیو اور ٹیلی وژن کا بھی نہیں ہوتا۔

کاش اخبار جنگ کے مدیران انتظامی "اردو کا مرثیہ" ۷ جولائی کو اشتعال انگیز انداز میں سیاہ حاشیوں کے ساتھ نہ چھاپتے۔!

اس المیئے کا افسوس خود مصنفِ مرثیہ حضرت رئیس امروہوی کو بھی ہے۔ چنانچہ حضرت رئیس امروہوی اخبار جنگ کی اشاعت مورخہ ۱۳ اگست میں خود یوں رقمطراز ہیں۔

وہ بھٹو سے سیاسی انتقام لینا چاہتے تھے

"میری نظم "اُردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" اردو کی زبوں حالی کا مرثیہ ہے اور بس —— اس نظم میں نہ کسی طبقے پر ملامت کی گئی ہے نہ کسی زبان کی مخالفت۔ یہ نظم چونکہ لسانی بل کی منظوری کے وقت شائع کی گئی تھی۔ اس لئے اس کا اثر حیرت انگیز ہوا۔ اگر کسی دوسرے موقع پر شائع کی جاتی تو ہرگز اُردو کے حق میں کسی عوامی تحریک کو جنم دینے کا سبب نہ بنتی۔"

حضرت رئیس کے اس دستاویزی بیان سے بھی یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اگر مدیرانِ جنگ "اُردو کا مرثیہ" ۸ جولائی کی صبح نہ شائع کرتے تو اُردو کے حق میں کوئی عوامی تحریک نہ بھڑک اٹھتی۔

لیکن اخبار جنگ والوں کو تو اخبار کی فروخت کے علاوہ بھٹو حکومت سے اپنا دیرینہ بغض بھی نکالنا تھا۔ موقع اس سے اچھا کیا مل سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے پچھلے ۲۵ برس سے اکٹھے رہنے والے بھائیوں بھائیوں میں نفرت کی بندوق حضرت رئیس امروہوی کے کندھے پر رکھ کر داغ دی۔

بس پھر —— کیا کراچی سارے صوبہ سندھ میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی —— شہر شہر، گاؤں گاؤں، قریہ قریہ آگ ہی آگ ——

اس آگ کی تپش ایوانِ صدر راولپنڈی میں صدر بھٹو نے بھی محسوس کی اور انہوں نے اس آگ کو بجھانے کے لئے کراچی سے سندھی بولنے والے سندھیوں اور اردو بولنے والے سندھیوں کے دو وفود اس انتباہ کے ساتھ پنڈی طلب کئے کہ۔

"جب تک لسانی تنازعہ اطمینان بخش طور پر طے نہیں ہو جاتا ان دونوں وفود کو واپس کراچی نہیں جانے دیا جائے گا۔"

وہ رات ہفتہ ۸ جولائی کی رات تھی۔ کوئی گیارہ کا عمل ہو گا۔ میں کھانا کھا رہا تھا کہ میرے ایک فلم ساز دوست انکل فخرالدین کا فون آیا کہ

"صدر بھٹو نے تمہیں بھی پنڈی طلب کیا ہے۔ ابھی میں نے ریڈیو کی خبروں میں تمہارا نام سنا ہے چاہو تو اس کے فوراً بعد انگریزی کی خبروں میں اپنا نام سُن لو۔"

میں نے انگریزی میں خبریں سنیں تو واقعی اردو بولنے والے سندھی وفد کے اراکین میں میرا بھی نام تھا۔ میرے علاوہ اردو بولنے والے سندھی وفد میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، جی اے مدنی، شاہ فرید الحق، پروفیسر غفور احمد، حسین امام۔ نواب مظفر حسین خان، پروفیسر اے۔ بی اے حلیم، رئیس امروہوی، سید محمد تقی، شوکت صدیقی اور ابنِ انشاء کے نام بھی تھے۔

ابن انشاء ان دنوں زردامریکہ عرف جاپان کے شہروں میں آوارہ اور رسوا ہو رہے تھے۔ وفد کے اراکین میں سے صرف شوکت صدیقی، سید محمد تقی اور رئیس امروہوی سے میرا یارانہ تھا پروفیسر غفور احمد سے دیرینہ نیاز مندی تھی۔ پروفیسر حلیم علی گڑھ میں استادوں کے استاد یعنی پرو وائس چانسلر تھے۔ باقیوں میں سے کسی سے بھی ملاقات نہ تھی۔

رات گئے وزیر مملکت برائے امورِ عامہ جناب معراج محمد خان صاحب کا بھی راولپنڈی سے فون آیا تو یقین آ گیا کہ واقعی صدر بھٹو نے اس حقیر فقیر پر تقصیر کو بھی طلب فرمایا ہے اور پیر ۱۰ جولائی کو مجھے لازماً پنڈی پہنچنا ہے۔

۱۰ جولائی کے نام پر میں یوں بھی پھڑک اٹھا کیونکہ ۱۰ جولائی کو شملہ کانفرنس کی کارروائی کی توثیق کے لیے قومی اسمبلی کا تاریخی اجلاس بھی منعقد ہونے والا ہے، گویا ایک ٹکٹ میں دو مزے !!

نواب مظفر

اور شاہ

فرید الحق

مطمئن ہو گئے

صبح اتوار ۹ جولائی کوئی ۹ بجے یارِ عزیز جناب شوکت صدیقی کا ٹیلیفون آیا کہ :-

"رات ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے گھر اردو تحریک کے علمبرداروں کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا جس میں دائیں بازو کے مخصوص سیاسی نظریہ رکھنے والے اصحاب نے حسین امام، ابنِ انشاء، شوکت صدیقی اور ابراہیم جلیس کے ناموں پر سخت اعتراض کیا ہے اور ان کی جگہ ان چار اصحاب کو پنڈی لے جانا طے کیا ہے:

"ڈاکٹر عالیہ امام، رشید کوثر، صدر انجمن اتحادِ طلباء جامعہ کراچی، عبدالباری خان صدر این ایس ایف (کاظمی گروپ) اور ڈاکٹر یٰسین زبیری۔"

شوکت کے فون کے بعد اخبارات میں بھی اس جلسے کی روئیداد پڑھی تو شوکت صدیقی کے فون کی تصدیق ہوئی۔

ابھی میں کوئی فیصلہ بھی نہ کر پایا تھا کہ اسسٹنٹ کمشنر جناب ظفر اللہ خان کا فون آیا جس کے ذریعے انہوں نے پنڈی جانے کی باضابطہ سرکاری دعوت دے دی۔

ادھر شہر میں چاروں طرف ہنگامے ہو رہے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ پی ای سی ایچ ایس اور ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی جہاں کبھی کوئی فساد نہیں ہوتا، اس مرتبہ یہ علاقے بھی نفرت کی آگ میں جل رہے تھے۔

چھوٹے چھوٹے لڑکے اور بڑی عمر کے آوارہ نوجوان سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر رہے تھے، آگ جلا رہے تھے کاریں روک روک کر ونڈ اسکرین اور شیشے پر لکھ رہے تھے

"اردو صرف اردو !"

سڑکوں اور دیواروں پر نئے نئے نعرے اور جذباتی اشعار لکھے گئے تھے مثلاً

"کھو گنجے مچھل تالپور : ہڑتال کیسی رہی ؟"

~ رسول اللہ کی خاطر تھی خدا کو منظور
ورنہ قرآن اترتا بزبانِ اردو

ہماری پیر الٰہی بخش کالونی کا نام یار لوگوں نے "اردو کالونی" رکھ دیا تھا۔ حالانکہ ضعیف العمر سندھی رہنما پیر الٰہی بخش اردو زبان کے بڑے والہ و شیدا بزرگ ہیں۔ علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی اور کراچی میں مہاجرین کے لیے سب سے پہلی کالونی انہی کی مدد اور انہی کے نام سے قائم کی گئی تھی اور اب تک اردو بولنے والے مہاجرین اسی کالونی میں رہتے ہیں مگر اس وقت کون کسے سمجھا سکتا تھا۔ ہر شخص کا پارہ چڑھا ہوا تھا، مرنے مارنے پر تلا ہوا تھا۔

شوکت صدیقی پنڈی جانے کے لیے ڈانواں ڈول ہونے لگے لیکن میں نے مصمم عزم کر لیا کہ میں پنڈی ضرور جاؤں گا۔ اگر کسی وجہ سے لسانی کانفرنس میں شریک نہ ہو سکا تو قومی اسمبلی کا شملہ کانفرنس کے بارے میں تاریخی اجلاس دیکھ لوں گا۔

میں نے اردو وفد سے الگ نشست کا مطالبہ کر دیا

شوکت صدیقی کی احتیاط اپنی جگہ صحیح تھی کیونکہ وہ چاروں طرف سے انتہا پسندوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے ـــــــ !

میرا بھی کم و بیش یہی حال تھا لیکن میرے نام "ابراہیم" کا میری زندگی پر بڑا اثر ہے اور یہی نام "بے خطر آتشِ نمرود" میں کود پڑنے کا عادی بھی ہے۔

شام کو میں نے ڈپٹی کمشنر کراچی جناب کنور ادریس سے فون پر صلاح لی کہ آیا مجھے پنڈی جانا چاہیئے یا نہیں؟ کنور ادریس صاحب کا کہنا تھا کہ :۔

"ہر چند میرے پاس بھی وفود آئے۔ جنہوں نے آپ کے شوکت صدیقی اور ابنِ انشاء کے ناموں پر سخت اعتراض کیے ہیں لیکن چونکہ آپ کو صدرِ مملکت نے بلایا ہے۔ آپ کو جانا چاہیئے۔ پروٹوکول کا تقاضا یہی ہے۔"

کنور صاحب کے مفید مشورے کو پلے باندھ کر میں نے سامانِ سفر باندھنا شروع کیا۔

وہ پیر ۱۰ جولائی کی بڑی ڈراؤنی صبح تھی۔ سارا شہر کراچی جھلس رہا تھا، کراہ رہا تھا، سڑکوں پر سناٹا تھا۔ ٹیکسی اور رکشا والے گزشتہ دو روز سے فاقے کر رہے تھے۔ میرے بھائی کی کار عین وقت پر خراب ہو گئی۔ اب ہوائی جہاز کے اڑنے میں صرف ایک گھنٹہ رہ گیا تھا۔ ایسے پریشانی کے عالم میں عموماً یارِ عزیز سہام مرزا (ڈویژنل مینیجر نیو جوبلی انشورنس) میرے کام آتے ہیں چنانچہ میں نے انہیں فون کیا۔ وہ بغیر منہ ہاتھ دھوئے سلیپنگ سوٹ اور مارننگ گون ہی میں ملبوس کار لے کر آ گئے۔ اور پھر ہم راستے میں جگہ جگہ رکاوٹوں کو ہٹاتے اور آگ بجھاتے ہوائی اڈے پر پہنچے تو ہوائی جہاز کے اڑنے میں صرف ۲۵ منٹ باقی تھے۔

پی آئی اے والوں سے میں نے درخواست کی کہ اگر میری نشست اردو وفد کے ساتھ ہے تو الگ کر دی جائے۔ چنانچہ مجھے الگ نشست دے دی گئی۔ میرے ساتھ پاک فوج کے ایک میجر معین الحق صاحب اور ڈاکٹر شفیع الدین خان مرحوم کے سمدھی اور "کے ڈی اے" کے ریٹائرڈ انجینئر عزیز قریشی صاحب تشریف فرما تھے۔ دونوں نہایت مرنجان مرنج ہمسفر تھے سفر کا آغاز اچھا ہوا۔

ہوائی جہاز کی پرواز کے تھوڑی دیر بعد نواب مظفر حسین خان اور شاہ فرید الحق صاحب کسی کام سے، ہماری نشستوں کے پاس آئے۔ عزیز قریشی صاحب نے میرا دونوں سے تعارف کرایا۔ شاہ فرید الحق صاحب کی تصویریں اخباروں میں دیکھی تھیں۔ نواب مظفر حسین خان سے بھی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ نواب مظفر کو گلہ تھا کہ میں نے ان کے خلاف بہت سے کالم لکھے ہیں۔ باتوں باتوں میں مجھ سے یہ پوچھا گیا کہ :۔

"اردو کے بارے میں آپ کا کیا موقف ہے ـــــ ؟"

میں نے انہیں سیدھی اور سچی بات بتا دی کہ :۔

"اردو میرا پیشہ، ہی نہیں بلکہ میری اور میرے اہل و عیال کی زندگی بھی ہے۔ اگر بالفرضِ محال اردو کا استعمال ممنوع قرار دیا جائے تو سب سے پہلے جو فاقوں سے مرے گا وہ ابراہیم جلیس ہوگا۔"

پھر میں نے نام بہ نام انہیں بتایا کہ وفد میں

مدنی نے پوچھا: "غدّاری تو نہیں کرو گے

جتنے بھی اصحاب ہیں وہ بغیر اردو کے بھی جی سکتے ہیں کسی کو پنشن ملتی رہے گی، کوئی انگریزی زبان کا استاد بن جائے گا۔ کوئی انگریزی میں نسخے لکھ کر مریضوں کو دوائیاں دے گا وغیرہ وغیرہ ! لیکن میں کیا کروں گا؟ شاہ فرید الحق اور نواب مظفر حسین خان نے غالباً میرے اس استدلال کو قبول کر لیا اور نواب مظفر بولے :۔

"اچھا تو پھر آپ ہمارے ساتھ کانفرنس ٹیبل پر بیٹھیں گے۔"

میں ابھی کوئی جواب نہ دے پایا تھا کہ اعلان ہوا کہ "ہم راولپنڈی اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں !!"

---

۹ بجکر پانچ منٹ پر ہم راولپنڈی اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر اترے۔ وفد کے ایک رکن جی۔ اے مدنی صاحب بھی تھے۔ ہوائی جہاز سے اتر کر ہوائی اڈے کی عمارت کی طرف جاتے ہوئے ان سے بھی علیک سلیک ہوئی۔ موصوف کراچی میں کمشنر رہنے کے علاوہ پرانے علیگ، مرزا جمیل الدین عالی کے ہمزلف، نواب افتخار احمد خان عدنی کے برادرِ بزرگ اور نواب اسمٰعیل خان کے صاحب زادے ہونے کے باعث میرے لیے بزرگوں کی طرح قابلِ احترام ہیں مگر انہوں نے بڑے جلے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا :۔

"غدّاری تو نہیں کرو گے ؟"

یہ سوال سن کر جیسے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جی تو چاہا کہ کہہ دوں :۔

"غداری تو انڈین سِول سروس کے افسران ہی کر سکتے ہیں !!"

پھر جی میں یہ بھی آیا کہ ان سے پوچھوں کہ :۔

"جناب والا ! جب تک آپ سرکاری افسر رہے آپ کو اس مظلوم قوم کی تباہی اور اردو زبان کا کوئی خیال نہ آیا لیکن جیسے ہی آپ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے ایک دم سیاسی لیڈر بن بیٹھے۔"

لیکن ان کی بزرگی اور مرزا جمیل الدین عالی اور نواب افتخار احمد خان عدنی کے چہرے سامنے آ گئے۔ چپ ہو رہا کہ، چلو بزرگوں کی بات کا کیا برا مانیں !

ہوائی اڈے سے اپنا اپنا سامان لے کر مسافروں کے لاؤنج میں پہنچے کہ وہاں ایوانِ صدر کے میزبان استقبال کے لیے موجود ہوں گے مگر وہاں نہ کوئی آدمی تھا اور نہ آدم زاد !

(باقی آئندہ)

بادشاہ اپنی چیک بُکیں لیکر تارکِ دنیا ہوگیا

انگریز دستکار کے انگوٹھے کاٹتے تھے ہم پورے دستکار کو کاٹ دیتے ہیں۔

ابنِ انشاء

● کسی ملک میں ایک تھا بادشاہ، بڑا دانش مند، مہربان اور انصاف پسند، اس کے زمانے میں ملک نے بہت ترقی کی اور رعایا اس کو بہت پسند کرتی تھی۔ اس بات کی شہادت نہ صرف اس زمانے کے محکمہ اطلاعات کے کتابچوں اور پریس نوٹوں سے ملتی ہے بلکہ بادشاہ کی خود نوشت سوانح عمری سے بھی۔

شاہ جمجاہ کے زمانے میں ہر طرف آزادی کا دور دورہ تھا۔ لوگ آزاد تھے، اور اخبار آزاد تھے کہ جو چاہیں لکھیں۔ بشرطیکہ وہ بادشاہ کی تعریف میں ہو خلاف نہ ہو۔

اس بادشاہ کا زمانہ ترقی اور فتوحات کے لئے مشہور ہے۔ ہر طرف خوشحالی ہی خوشحالی نظر آتی تھی۔ کہیں تل دھرنے کو جگہ باقی نہ تھی۔ جو لوگ لکھ پتی تھے، دیکھتے دیکھتے کروڑ پتی ہو گئے۔ حسن انتظام ایسا تھا کہ امیر لوگ سونا اچھالتے اچھالتے ملک کے اِس سرے سے اُس سرے تک، بلکہ بعض اوقات بیرون ملک بھی چلے جاتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ پوچھے اتنا سونا کہاں سے آیا اور کہاں لئے جا رہے ہو۔

روحانیت سے شغف تھا۔ کئی درویش ہوائی اڈے پر لینے، چھوڑنے جاتے تھے یا اس کی کامرانی کے لئے چلے کاٹتے تھے۔ طبیعت میں عفو اور درگزر کا مادہ از حد تھا۔ اگر کوئی آکر شکایت کرتا تھا کہ فلاں شخص نے میری فلاں جائیداد ہتھیالی ہے یا فلاں کارخانے پر قبضہ کر لیا ہے۔ تو مجرم خواہ بادشاہ کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو، وہ کمال سیر چشمی سے اسے معاف کر دیتے تھے۔ بلکہ شکایت کرنیوالوں پر خفا ہوتے تھے کہ عیب جوئی بُری بات ہے۔

جب بادشاہ کا دل حکومت سے بھر گیا تو وہ اپنی چیک بکیں لیکر تارکِ دنیا ہو گیا۔ اور پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں اب بھی زندہ ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

● عزیزو! بہت دن پہلے اس ملک میں انگریزوں کی حکومت ہوتی تھی، اور درسی کتابوں میں ایک مضمون "برکات حکومت انگلیشیہ" کے عنوان سے شامل رہتا تھا۔ اب ہم آزاد ہیں۔ اس زمانے کے مصنف حکومت انگلیشیہ کی تعریف کیا کرتے تھے۔ کیونکہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ ہم اپنے عہد کی آزاد اور قومی حکومتوں کی تعریف کریں گے۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔

عزیزو! انگریزوں نے کچھ اچھے کام بھی کئے لیکن ان کے زمانے میں خرابیاں بہت تھیں کوئی حکومت کے خلاف بولتا تھا یا لکھتا تھا تو اس کو جیل بھیج دیتے تھے..... اب نہیں بھیجتے۔ رشوت ستانی عام تھی، آج کل نہیں ہے۔ دکاندار چیزیں مہنگی بیچتے تھے اور ملاوٹ بھی کرتے تھے۔ آج کل کوئی مہنگی نہیں بیچتا، ملاوٹ بھی نہیں کرتا۔ انگریزوں کے زمانے میں امیر اور جاگیردار عیش کیا کرتے تھے، غریبوں کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ اب امیر لوگ عیش نہیں کرتے اور غریبوں کو ہر کوئی اتنا پوچھتا ہے کہ وہ تنگ آجاتے ہیں۔ خصوصاً حق رائے دہندگی بالغاں کے بعد سے۔

تعلیم اور صنعت و حرفت کو لیجئے۔ ربع صدی کے مختصر عرصے میں ہماری شرح خواندگی اٹھارہ فی صد ہوگئی ہے۔ غیر ملکی حکومت کے زمانے میں ایسا ہو سکتا تھا؟ انگریز شروع شروع میں ہمارے دستکاروں کے انگوٹھے کاٹ دیتے تھے، اب کارخانوں کے مالک ہمارے اپنے لوگ ہیں۔ دستکاروں کے انگوٹھے نہیں کاٹتے، ہاں کبھی کبھی پورے دستکار کو کاٹ دیتے ہیں۔ آزادی سے پہلے ہندو بنیے اور سرمایہ دار ہمیں لوٹا کرتے تھے، ہماری خواہش تھی کہ یہ سلسلہ ختم ہو اور ہمیں بنیے اور سیٹھ لوٹیں۔ الحمد للہ کہ یہ آرزو پوری ہوئی۔ جب سے حکومت ہمارے ہاتھ میں آئی ہے ہم نے ہر شعبے میں بہت ترقی کی ہے۔ درآمد برآمد بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ ہماری خاص برآمدات دو ہیں، وفود اور زرمبادلہ، درآمدات ہم گھٹاتے جا رہے ہیں۔ ایک زمانہ میں تو خارجہ پالیسی تک باہر سے درآمد کرتے تھے۔ اب یہاں بننے لگی ہے۔

مزدور



احمد علی

شام آسمان پر ہلکے ہلکے بادل، شام، سُرخ اور عنابی: آسمان پرخون، اس جگہ جہاں زمین اور آسمان ملتے ہیں۔ افق پرخون جو بتدریج ہلکا ہوتا جاتا تھا، نارنجی اور گلابی پھر سبز اور نیلگوں اور سیاہی مائل نیلا جو سَر کے اوپر سیاہ ہوگیا تھا۔ سیاہی ——— سَر پر موت کی سیاہی! اور ایک آدمی زمین سے بیس فٹ اونچے کھمبے پر چڑھا ہوا، بندر کی طرح کھمبے سے چمٹا، ایک رسّی کے ٹکڑے پر چوتڑ ٹکائے ایک لچھّے میں سے تار لگا رہا تھا۔ یونیورسٹی کی سڑک پر بجلی کی روشنی کے لیے تار اور کھمبے۔ آسودہ حال طالبعلموں اور موٹروں پر چڑھنے والے رئیسوں کے لیے روشنی ——— کیونکہ مزدوروں کو بھی اپنے پیٹ کا دوزخ بھرنا ہے ——— خوشحال اور کھاتے پیتے لوگوں کے لیے، جو قیمتی کپڑے پہنتے ہیں، جن کے دماغوں میں گوبر بھرا ہوتا ہے۔ روشنی کرنے کو کھمبوں پر چڑھ کے، ہوا میں لٹک کر اپنی جان خطرے میں ڈالنے کے بعد اس کو صرف چھ آنے روز ملتے اور نوجوان کالے کوٹ سفید پاجامے پہنے ہوئے آسودگی کی شان اور پیسے کے گھمنڈ سے اس بندر پر جو ان کی چربی سے ڈھکی ہوئی آنکھوں کے لیے روشنی لگانے کو چڑھا ہوا تھا، ایک نظر ڈالتے ہوئے گزر جاتے:

"ہمارے بورڈنگ ہاؤس کے پیچھے والی سڑک پر روشنی لگ رہی ہے۔ اب تو بجلی کی روشنی ہو گی...... بجلی کی روشنی!" ——— اور ان کے کھوکھلے دماغ اسی کے راگ گاتے اور بجلی کے خواب دیکھتے ——— لیکن کوئی بھی اس مزدور کا خیال نہ کرتا جو ننگے بدن ہوا میں لٹکا ہوا پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کھمبے پر تار لگا رہا تھا۔ اور ان کے پیروں کی احمقانہ آواز کھٹ.... کھٹ... کھ.... ٹ ہوتی اور وہ مستانہ روی سے چہل قدمی کرتے ہوئے گزر جاتے۔ اور مزدور کی رگیں اور پٹھے محنت کے اثر سے اس کے جسم پر چمکتے دکھائی دیتے اور رات بڑھتی آتی تھی۔

مزدور ہوا میں ٹنگا ہوا تیزی سے کام کرتا رہا۔ اندھیرا ہو چلا تھا لیکن کام ختم کرنا لازمی تھا۔ گھر کا تصوّر اس کے دماغ میں بندھا ہوا تھا، سوکھی روٹی اور پیاز کا، بیوی بچوں اور گھر کا، اور اس کی آنکھوں میں اپنی جھونپڑی کے سامنے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ حقہ پینے کا خیال پھر گیا، اور آرام اور نیند کا........ اس نیند کا جو دِن بھر کام کرنے اور ٹھیکیدار کی گالیاں سننے کے بعد آتی ہے اور ٹھیکیدار عیش و عشرت میں موجیں اڑاتا تھا۔

وہ جلدی جلدی کام کرنے لگا۔ پَیر کے انگوٹھے سے تار اوپر کھینچتا، ایک ہاتھ سے اوپر اٹھتا اور دوسرے سے لپیٹتا!

سامنے لان پر یونیورسٹی اسٹاف کلب کے ممبروں کے ہنسنے، بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو پنکھے کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ جس کو ایک لڑکا کھینچ رہا تھا۔ کچھ ابھی تک گھٹتی ہوئی روشنی میں ٹینس کھیل رہے تھے، کچھ میٹھے شربت پی رہے تھے یا تصویر دار میگزینوں کے ورق پلٹ رہے تھے، یا گپ لڑانے اور ٹھٹھے مارنے میں مشغول تھے۔

مزدور ایک سیکنڈ کے لیے پسینہ پونچھنے کے لیے رُکا اس کی نگاہ اسٹاف کلب کے ممبروں پر پڑی ———

——— "سُسرے کیسے دھنا سیٹھ بنے بیٹھے ہیں، ہمیں تو جل کی بوند نائیں ملتی، ان سارن کی موج ہے کیسے سربت پیوت ہیں ———"، اور اس نے منہ بنا کر زمین پر تھوکا۔ دوسری طرف سے جمعدار آ نکلا جس نے ترقی کچھ تو اس لیے کی تھی کہ وہ ذہین تھا، لیکن زیادہ تر اس لیے کہ وہ

ٹھیکیدار کے گھر پر خالی وقت میں مفت کام کرتا تھا۔

"کیوں بے! ابھی تک ختم نہیں کیا۔ تیری خاطر ہم کو رُکنا پڑ رہا ہے !!"

"اجی گھر تو ہم کو بھی جانا ہے۔"

"کھسکنا چاہتا ہے کہ نہیں ..... بک بک سے کام ہوئے ہے تنکھا میں سے کٹوا دوں گا، سات بج چکے ہیں !!"

مزدور نے جلدی جلدی کام کرنا شروع کیا لیکن تار کا لچھا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر پھیل گیا۔ جمعدار نے ایک گالی دی اور سڑک کے بیچ میں کھڑا ہو کر تار لپیٹنے لگا۔ اتنے میں "پیں ... پیں .... پیں" موٹر کا ہارن سنائی دیا۔ موٹر کار رُک گئی۔

"حرام زادہ! کیا دکھائی نہیں دیتا؟" ایک صاحب جن کا سر چھوٹا سا تھا اور بڑی بڑی مونچھیں دونوں طرف لٹکی ہوئی تھیں، چلّانے لگے ــــ "راستے سے ہٹ کر کام نہیں کر سکتا؟ گدھا کہیں کا ــــ جلدی سمیٹ، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

جمعدار نے جلدی سے تار ایک طرف کھینچ لیا۔

"سرُو تیری وجہ سے گاری رُکی۔ کیوں بے! اسی کام کی مجوری ملتی ہے؟ اگر تنکھا میں سے نہ کٹوایا تو میرا نام بھی رام لال نہیں۔"

اور غریب مزدور نے بنئے کا خیال کیا۔ جسے اس کو پچاس روپے دینے تھے۔ بنئے نے بھی اسے گالیاں دیں اور جیل بھجوانے کی دھمکیاں دے کر سُود چوگنا کر دیا تھا۔ بے ایمان کس طرح ناک میں دم کرتے ہیں۔ قطرہ قطرہ لہو چوس لیتے ہیں۔ لیکن حاجت مند بے چارا اگر ان کے پاس نہ جائے تو کیا کرے۔ مزدور کی لڑکی بارہ برس کی ہو گئی تھی لڑکوں کے ماں باپ جہیز کا سامان اور بہت زیادہ روپیہ مانگتے تھے اور اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ برادری نے اس بات پر اس کا حقّہ پانی بند کر دیا تھا۔ برہمنوں کو روپے چٹا کے برادری کو منانا لازمی تھا۔ اس کے لیے سو آدمیوں کو کھانا کھلانا تھا۔ اس کے علاوہ شادی کے دیوتا کو بھی بھینٹ چڑھانی تھی۔ دیوتاؤں کو بھی روپے کی ضرورت تھی وہ بھی بنئے تھے اور وہ سال بھر سے زیادہ خالی بیٹھا رہا برہمن نے صرف مندر میں پھول بتاشے چڑھانے کے دو روپے لیے تھے۔ برادری کو کھانا دینا ضروری تھا اور اس پر شادی۔ ہر چیز میں روپیہ کی ضرورت تھی اور غریب کا پیٹ کاٹ کر بنئے موٹے ہوتے ہیں ــــ !

جمعدار نے تار کو ایک رسّی سے باندھ کر کھمبے پر مزدور کو پھینکا وہ اپنے پیروں کو کھمبے سے لٹکا کر اسے لپکنے کے لیے جھکا لیکن لچھا اس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ اس کا دل کام سے بے زار ہو چکا تھا اور اس کا جسم ڈھیلا اور بے جان سا ہو گیا تھا ــــ جمعدار نے لچھا دوبارہ پھینکا لیکن پھر وہ رہ گیا۔ مزدور نے جھپٹ کر اسے لپکنے کی کوشش کی لیکن رسی ٹوٹ گئی اور وہ دور سڑک پر چھاتی کے بل جا کر گرا۔ جمعدار کے منہ سے ایک چیخ نکلی ...... !

یونیورسٹی اسٹاف کلب کے ممبر اس آواز پر اپنی کرسیوں سے مڑے۔

"بھئی کیا ہوا؟"

"ایک آدمی گر گیا۔"

"کہاں ــــ ؟"

"وہ مزدور جو کھمبے پر کام کر رہا تھا!"

وہ دیکھنے کے لیے اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے ایک صاحب تھوڑی دور دیکھنے آئے لیکن واپس لوٹ کر سوچ بچار میں مشغول ہو گئے۔ دو تین نے ٹینس لان کے اس پار جانے کی ہمت کی لیکن وہ جھاڑیوں کے اس طرف ہی رہ گئے اور ترس اور افسوس کا اظہار کرنے لگے لیکن خون میں لتھڑے ہوئے آدمی تک جانے کی جراءت کسی کو نہ ہوئی ــــ !!

"اُف ــــ کتنا خون نکلا ــــ بڑا تندرست رہا ہوگا !!"

"تہ ــــ تہ ــــ تہ ــــ !"

اس عرصہ میں کچھ نوکر اور طالب علم مزدور کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ لیکن کوئی بھی اس کے نزدیک نہ آتا تھا۔ کوئی اس کو چھونے کی کوشش نہ کرتا تھا اور آدمی ہلا تک نہیں اس کے منہ سے ایک آہ تک بھی نہ نکلی۔ اس کا جسم خون میں لت پت تھا۔ اس کی آنکھیں اوپر کھنچ گئی تھیں اس کے رگ پٹھوں کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ اب وہ گھر، آرام اور نیند کی راہ دیکھ رہا تھا۔

کوئی چلّایا ــــ "پلنگ لاؤ ــــ !" لیکن کسی نے اسے چھوا تک نہیں۔ ہر شخص موت کے ڈر سے خوفزدہ تھا۔ کچھ تانگے میں آتے ہوئے لوگ بھیڑ دیکھ کر اتر پڑے اور دھکے دیتے ہوئے اندر پہنچے لیکن وہ بھی دُور ہی سے گھورتے رہے۔ وہ بھی خوفزدہ تھے ــــ موت سے ــــ گویا موت کا پتلا زمین پر پڑا ہوا تھا۔ دوسرے مزدور بھاگتے ہوئے آئے انہوں نے اسے پلنگ پر ڈالا اور ہسپتال لے چلے۔

ایک پروفیسر صاحب جو اوروں کی طرح دُور ہی سے کھڑے دیکھ رہے تھے بولے ــــ "بھئی سول سرجن کو بلانا چاہیئے۔"

"میجر حسن کو فون کر دو .... !"

پھر وہ اور لوگوں سے رائے لینے کو واپس چلے گئے۔ لیکن سب اس واقعہ کو بھول چکے تھے اور گپ شپ اور ایک دوسرے کی برائی میں مشغول تھے۔ پروفیسر صاحب میجر حسن کو فون کرنے چلے جس پر کچھ لوگوں نے ان کو رقیق القلب اور بیوقوف کہنا شروع کیا۔

"بھئی تم بھی کیا آدمی ہو، ایک مزدور کے لیے اتنی پریشانی ــــ !"

میجر حسن اپنے دفتر میں تھے نہ گھر پر، وہ کلب میں تشریف رکھتے تھے اور چند لڑکیوں میں اس قدر منہمک تھے کہ فون تک جانا ناگوار معلوم ہوتا تھا۔

"ہیلو .... و ..... و ..." انہوں نے رئیسانہ لہجہ میں کہا۔

"ہیلو ... کیا میجر حسن بول رہے ہیں؟ میں ہوں پروفیسر عابد، میجر صاحب براہ کرم فوراً تشریف لے آئیے ایک آدمی کھمبے پر سے گر پڑا اور خون میں نہایا ہوا ہے۔"

"بھئی کوئی بات نہیں ــــ اس قسم کے تو سینکڑوں واقعات روزانہ پیش آتے ہیں۔ وہ تو مر گیا ہوگا۔"

"نہیں ــــ نہیں ــــ چلئے تو آیئے۔ شاید آپ اس کی جان بچا سکیں۔ اس کو یونیورسٹی کے ہسپتال بھیج رہے ہیں ــــ !"

"ڈیم ــــ" میجر صاحب نے آہستہ سے کہا۔

جب وہ اپنی جگہ پر واپس آئے تو ایک نوجوان لڑکی نے پوچھا:۔

"کیا بات تھی ــــ ؟"

"کچھ نہیں ــــ حسبِ معمول کوئی شخص کہیں سے گر پڑا۔"

"مرا تو نہیں ــــ ؟"

"معلوم نہیں لیکن اغلب یہی ہے ــــ کچھ اور پیئو گی ــــ ؟"

"لیکن آپ اسے دیکھنے جایئے"

"اچھی بات ہے۔ کوئی جلدی نہیں۔ ایسے واقعات تو روز پیش آتے ہیں۔"

اور میجر صاحب بڑی دیر کے بعد اپنی کار میں آرام سے لیٹے ہوئے تشریف لائے۔ کچھ لوگ جو مزدور کی قسمت کا فیصلہ سننے کے انتظار میں ابھی تک کھڑے ہوئے تھے میجر صاحب کو دیکھ کر ایک طرف ہو گئے۔ میجر صاحب

باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمایئے

ہمارے علماء کے نزدیک نیکی شجرِ ممنوعہ ہے

حضرت علیؓ اور امام حسینؑ کی شہادت کے ذمہ دار فتوے باز علماء تھے۔

اسلامی عدالتوں کی عدم موجودگی میں یہ مفتیانِ کرام کہاں پیدا ہو گئے ۔۔۔؟

ابو مسلم صحافی

سب سے پہلے ہمیں یہ تعین کر لینا چاہیئے کہ شریعتِ اسلامیہ میں فتوے کی حیثیت کیا ہے اور فتویٰ دینے والے مفتی کا کیا مقام ہوتا ہے۔

اسلامی عدالتوں میں وکلا کا وجود نہیں پایا جاتا اس لیے کہ پیشہ ور وکیلوں کی موجودگی سے انصاف نہ صرف مہنگا ہو جانے کا احتمال ہو جاتا ہے بلکہ قانونی موشگافیاں پیدا کر کے اس کا خون بھی کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ اسلام عوامی بہبود کا مسلک ہے وہ انصاف کو مہنگا، طویل عرصے تک التواء میں ڈالنے اور گوناگوں پیچیدگیوں میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا یہ سب قباحتیں وکالت کے پیشہ اور پولیس کی عدم دیانت سے پیدا ہوتی ہیں۔ انصاف کے نام پر یہ بے اعتدالیاں اقتدار کے دلدادہ اہلِ یونان اور روما کو تو راس آگئیں لیکن درویشی اور فقر کے اصولوں پر قائم شدہ اسلامی نظام ان کا ہرگز متحمل نہ ہو سکا۔

چنانچہ اسلام نے وکیلوں کی جگہ قاضیوں کے مشیروں کے طور پر بالکل بے لوث عوام کی خدمت انجام دینے والے علماء کا مفتیوں کے لقب سے ایک طبقہ پیدا کر دیا جا ہا ان سے توقع کی گئی کہ یہ اپنے منصب اور علم کا لحاظ کرتے ہوئے ذاتی جذبات سے بالاتر ہو کر ترغیب و ترہیب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے "سید القوم خادمہم" کی مثال اپنے وجود سے پیدا کریں گے۔ اور قاضی اپنے فیصلوں کو ان کے مشوروں سے بہت حد تک سلجھا لیا کریں گے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس گروہ کی اکثریت عصبیت حسد، بغض، عناد، نفاق، ترغیب و ترہیب کا شکار ہو کر توقعات پر پوری نہیں اتری اور اپنے اس شرف سے محروم رہ گئی اور قاضی بھی ان سے ہم آہنگ ہو کر ظلم کے حصے دار بن گئے۔

قاضی کے بغیر مفتی کا وجود ایسے ہی ہے جیسے جج یا مجسٹریٹ کی عدم موجودگی میں وکیل کی حیثیت! یعنی اگر کوئی عدالت ہی نہیں تو وکیل چہ معنی دارد"! معلوم نہیں کہ ہمارے مفتیانِ کرام قاضی کی عدم موجودگی میں یہ منصب کیسے سنبھالے بیٹھے ہیں۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ قاضی کے اختیارات بھی خود ہی استعمال کر رہے ہیں یعنی مفتیانِ کرام کے فتوے (رائے) قاضیوں کے فیصلوں کی حیثیت میں پیش کیے جاتے ہیں حالانکہ جب اسلامی عدالتوں کا وجود ہی نہیں ہے تو قاضی یا مفتی کا دعویٰ کرنا بالکل زائد از ضرورت ہے۔ البتہ بحیثیت فقیہہ رائے کا اظہار کیا جا سکتا ہے سزا تجویز نہیں کی جا سکتی۔ جیسا کہ عام طور پر کفر کے فتووں میں ہوتا آیا ہے۔ کفر کے فتوے اور ان کے ضمن میں تجویز کردہ سزائیں مسلمانوں میں انتشار کا سبب تو بن سکتی ہیں لیکن کوئی اصلاحی پہلو نہیں پیدا کر سکتیں۔ آج تک کا تجربہ اسی کا شاہد رہا ہے۔ فتنہ کے دروازے امت پر کھول دینا فقہا کو کسی طرح زیب نہیں دیتا کیونکہ اس بارے میں ارشاد ہے :-

"الفتنۃ اشد من القتل"

یہ ناخوشگوار صورتِ حال ہمارے سامنے تاریخِ اسلام کے کچھ زیادہ اوراق پلٹنے کے بعد نہیں آتی۔ ابھی صحابہ کا دور ہی تھا اور ہوسِ زر نے لوگوں کو زیادہ اندھا نہیں کیا تھا کہ جبہ و دستار کا رنگ پھیکا پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ نہایت ہی تلخ تجربہ کے اظہار میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں :-

"فتویٰ دینے والوں کا حال یہ ہے کہ جب ان میں سے کسی کے پاس کوئی مسئلہ شرعی حکم کے لیے آتا ہے تو وہ اپنی رائے سے اس کے بارے میں فیصلہ کر دیتا ہے اور جب یہی مسئلہ کسی دوسرے کے پاس آتا ہے تو وہ اس کے برعکس فیصلہ صادر کر دیتا ہے۔ پھر یہ سب اپنے اس سربراہ کے پاس جمع ہوتے ہیں جس نے یہ ذمہ داری سونپی تھی تو وہ ان سب کی توثیق کر دیتا ہے۔"

علم الاخلاق کی رو سے کسی عدلیہ کے سربراہ کے لیے قوتِ فیصلہ کی یہ کمی اس کی نہایت ہی نااہلیت کا ثبوت سمجھی جاتی ہے۔ انصاف کا تقاضا ہی یہ ہوتا ہے کہ حق اور باطل کے درمیان باریک سے باریک فرق کو محسوس کر لیا جائے اور پورے وثوق سے ایک رائے قائم کر لی جائے۔

تاریخ کے طالب علم سے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ حضرت علیؓ کی خود اپنی شہادت اس کفر کے فتوے کے نتیجہ میں ہوئی تھی جو خارجیوں نے ان کے خلاف دیا تھا اور حضرت حسینؑ کی شہادت کی ذمہ داری نہ تو اتنی یزید کے لشکریوں پر تھی اور نہ خود اس پر ہی جتنی بنو امیہ کے ان سو قاضیوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے قاضی شریح کی سربراہی میں یہ فتویٰ دیا تھا :-

"یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ گیا ہے کہ حسینؓ ابنِ علیؓ نے امام المسلمین امیر المومنین یزید بن معاویہ پر خروج کیا ہے۔ (یعنی بغاوت کی ہے) وہ دینِ رسولؐ سے خارج ہو گیا ہے۔ تمام لوگوں پر اس کا دفع اور قتل کرنا واجب ہے۔"

محی الدین ابنِ عربی فرماتے ہیں کہ اس فتوے کی بناء پر حسینؓ اکثر مسلمانوں کی حمایت سے محروم ہو گئے تھے اور ابنِ زیاد کے لشکریوں کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ صرف اسی قدر نہیں بلکہ واقعۂ کربلا کے بعد بھی قاضی شریح کا یہی مؤقف تھا۔ چنانچہ اپنے وقت کے اس سب سے بڑے

مسیلمہ جیسے جھوٹے مدعیِ نبوت کو کافر نہیں۔ کذّاب کہا گیا

فقیہہ سے حسینؓ کے بارے میں یہ الفاظ منسوب ہیں :۔

" خرج الحسین بحدہٖ ، وقتل لسیف جدہٖ "

حسینؓ حد سے گزر گئے تھے اور وہ اپنے ہی
نانا کی تلوار سے مارے گئے۔"

یہ کفر کے فتوے کا حربہ جو دورِ اوّل میں حضرت علیؓ اوران کے جانشینوں پر بڑی کامیابی سے آزمایا گیا تھا اور بعد میں بھی اہلِ حق کے استیصال کے لیے بہت مؤثر ثابت ہُوا۔ اس کی زد میں نہ صرف سید محمد جونپوری، شیخ عبداللہ نیازی، شیخ علائیؒ شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی اور ان کے خاندان کے دوسرے اکابرین جن میں سیّد احمد بریلوی اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید بھی شامل ہیں، شیخ الفاضل حضرت محمد قاسم نانوتوی، شیخ الہند حضرت محمود الحسن سرسیّد احمد خان، مصطفےٰ کمال پاشا، اتاترک، شیخ الفاضل حضرت رشید احمد گنگوہی، شبلی نعمانی، شیخ الفاضل عبیداللہ سندھی، شیخ الفاضل حضرت طیّب صاحب صدر مدرس دارالعلوم دیوبند وغیرہ اہم صفِ دوم کے اکابرینِ ملت ہی آئے بلکہ امام رازی، امام غزالی، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، ابنِ رشد، ابو علی سینا، شیخ شہاب الدین عمر خیام، خواجہ حافظ اور زریاب جیسے صفِ اول کے بیشمار اہلِ علم کی خدمات کا صلہ بھی اسی تمغۂ کفر سے نواز کر دیا گیا۔

معلوم نہیں یہ خدا کی کتاب کے ترجمان، جانشینانِ رسولؐ اور حنفی مسلک کے علمبردار کہلانے والے افراد ہی کو نہیں بلکہ پوری کی پوری جماعتوں کو صرف اجتہادی اختلاف کی بنا پر جبکہ وہ قبلہ کے رُخ کتاب، فرائض اور رسالت پر پورا پورا اتفاق رکھتے ہیں کیسے کافر کہنے کی جرأت کرتے ہیں کیا ان کی نظر سے قرآنِ حکیم کی یہ آیت نہیں گزری :۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ
إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا

(پ - ۴ - ۹۴)

" جو تمہیں سلام کرے اسے تم یہ مت کہو کہ
تو مومن نہیں۔"

پھر کیا اس آیت کی تفسیر میں حضورؐ کا یہ عمل شاہد نہیں کہ آپؐ نے مسیلمہ جیسے مدعیِ نبوت کے زمین کی تقسیم کے غلط دعوے پر اسے سخت جھوٹا کذّاب تو کہا، کافر نہیں کہا۔ کیا ان عالم کہلانے والوں کی نظر سے ترمذی میں حضورؐ کا یہ ارشاد بھی نہیں گزرا :۔

" جو شخص کسی مسلمان پر کفر کی تہمت لگائے
تو وہ گویا اس کا قاتل ہے "

اور کیا آپؐ نے حضرت اسامہؓ کو یہ نہیں فرمایا تھا

" اے اسامہؓ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا
تھا کہ واقعی اس نے دل سے اقرار کیا تھا
یا ڈر کے مارے اسلام قبول کیا تھا ؟ "

پھر اپنے ہی پیشوا حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اس فقہی مسلک کو کیوں فراموش کر دیا جاتا ہے :۔

" کفر سے متعلق مسئلہ میں اگر ننانوے (۹۹)
احتمالات کفر کے ہوں اور ایک اس کی نفی
کر رہا ہو تو مفتی اور قاضی کے لیے اولیٰ یہی
ہے کہ وہ اس ایک پر فتویٰ دے وہ اس لیے
کہ ایک ہزار کافروں کو اسلام میں رکھ لینا
آسان ہے لیکن ایک مسلمان کو اسلام سے
خارج کر دینے کی غلطی بہت اشد ہے "

(شرح امام ابوحنیفہؒ صفحہ ۱۹۸ مطبعہ کانپور)

سقراط کا قول ہے کہ بدطینت وہ شخص ہے جو لوگوں کی برائیاں تو ظاہر کرے اور ان کی خوبیاں چھپا لے دینی رُخ سے جو عالم صحیح معنوں میں جانشینانِ رسولؐ ہوتے ہیں وہ خطا پوش اور کریم ہُوا کرتے ہیں۔ بات بات پر مردم آزاری نہیں کیا کرتے

اصل بات یہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ صحیح معنوں میں مزاج شناسِ رسولؐ اور منشائے خدا کو سمجھنے والے بزرگ تھے۔ انہیں علم تھا کہ کسی کلمہ گو کو کافر کہنے سے اس پر ارتداد لازم آجاتا ہے اور اس کی منکوحہ اس پر حرام ہو جاتی ہے۔ اس کے مال و متاع اور منقولہ و غیر منقولہ املاک پر فوری طور پر قبضہ کر کے اس کی گردن مار دینی ضروری ہو جاتی ہے۔ اگر وہ شخص زندہ رہ جائے تو تمام اہلِ ایمان گنہگار ہو جاتے ہیں لہٰذا وہ اتنی بڑی ذمہ داری سے اسلامی عدلیہ کو بچانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

اب ان اہلِ مکتب و مسجد کو کون بتائے کہ وہ لوگوں کو دھڑا دھڑ کافر نہیں بلکہ مرتد بنا کر کتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لیتے ہیں۔ اگر یہ مزاج شریعت کو پہچانتے ہوں اور جہلِ مرکّب کے مرض میں مبتلا نہ ہوں تو یقیناً خدا کی بارگاہ میں اتنی بڑی ذمہ داری لے کر نہ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک ان میں سے کوئی کامل پیدا نہیں ہو سکا۔ انہی میں سے ایک مفتی ان کے بارے میں یوں فتویٰ صادر کرتا ہے ؎

کامل اس طبقۂ زہاد سے نہ اٹھا کوئی
کچھ ہُوا ہے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

کافر کے لیے سزا نہیں تبلیغ ہے اور مرتد کے لیے فوری سزائے موت ہے۔ لہٰذا مسلمان کو کافر کہنا بذاتِ خود کم علمی اور شریعتِ اسلامیہ کے احکامات سے مکمل ناواقفیت کی دلیل ہے۔

دستارِ فضیلت سر پر رکھنے والے خوب اچھی طرح ذہن نشین فرما لیں کہ کتابوں کی لادی لادنے سے علم نہیں آجاتا۔ یہ ایک غلط فہمی ہے جس میں پوری امت کو مبتلا کر دیا گیا ہے۔ اس بارے میں قرآنِ حکیم کی کچھ اور ہی رائے ہے۔ اس کے ساتھ ہی علم کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ قلم اور زبان میں روانی ہو اور درسگاہوں کی اسناد بھی اس کا کافی ثبوت نہیں ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں الٹے نتائج پیدا کر دیتی ہیں۔

ایسے عالم جو نوشتۂ کتب ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور خدا اور اس کے رسولؐ کی منشاء سے واقفیت نہیں رکھتے۔ ایسے کم سوادوں کو قرآنِ حکیم "الحمار کمثل الحمار یحمل اسفارا" سند عطا کرتا ہے۔

حصولِ علم کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ذاتی اغراض سے بالا ہو کر مخلوق کی بھلائی کا جذبہ دل کی گہرائی میں پیدا کیا جائے۔ اور دوسروں کے مسائل ایسے ہی حل کرنے کی کوشش کی جائے جیسے اپنے ذاتی کئے جاتے ہیں۔ اس سے قوتِ مشاہدہ بڑھ جاتی ہے۔ اور انسانی رشتوں سے سہارا لینے کے بجائے انہیں مزید اضافے کی توفیق پیدا ہو جاتی ہے اور علم فروغ پاتا ہے۔

فلسفہ کے معلّمِ اول سقراط کی بھی علم کے متعلق یہی رائے ہے وہ کہتا ہے کہ نیکی کا نام علم ہے اور بدی کا جہل۔ اس کے برعکس ہمارے علماء کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی اکثریت دوسروں کو نیکی کی تلقین کرتی ہے اور خود اسے اپنے لئے شجرِ ممنوعہ سمجھتی ہے۔ چنانچہ اس بارے میں خواجہ حافظ فرماتے ہیں۔ ؎

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

باقی صفحہ ۵۸ پر ملاحظہ فرمائیے

پاکستانی سکے کی قیمت میں کمی

قرض کی رقم ۱۲۸ کروڑ - ادائیگی ۲۹۸ کروڑ

ابوسفیان

پاکستانی سکے کی قیمت میں کمی اس بات کا اظہار ہے کہ پاکستان پر سامراجی استحصال بڑھ رہا ہے۔ سکے کی قیمت میں کمی پاکستان پر بڑھتے ہوئے سامراجی استحصال کا نتیجہ ہے۔ یہی کمی اس استحصال کے اور زیادہ شدید ہونے کے نئے دور کا آغاز ہے۔

پاکستان نیم نوآبادیاتی ملک ہے۔ اس حیثیت میں پاکستان بین الاقوامی معاشی جال میں گندھا ہوا بھی ہے۔ اس کا ایک حصہ بھی ہے۔ پاکستان سامراجی مالیاتی سرمائے کی منڈی ہے جہاں پر سامراجی ممالک اپنا اپنا مالیاتی سرمایہ لگا کر پاکستانی عوام کا استحصال کرتے ہیں۔ پاکستان خام اشیاء غذا اور سستی قوتِ محنت فراہم کرتا ہے۔ اور مصنوعات کے لئے ایک منڈی ہے نیچے دیئے ہوئے چارٹ سے پاکستان کی معاشیات کے کردار سے پوری طرح واقفیت ہو سکتی ہے۔

چارٹ نمبر ۱

پاکستان کی بیرونی تجارت بابت ۷۱-۱۹۷۰ء

الف۔ بڑی اشیاء کی رو سے

(کروڑ روپوں میں)

برآمدات		درآمدات	
خام پٹ سن	۵۰/۱	مشینری	۱۷۴/۶
پٹ سن کی مصنوعات	۶۴/۸	مصنوعات	۱۰۰/۲
خام روئی	۲۷/	غذا اور مویشی	۵۸/-
سُوت	۳۲/۳	کیمیائی سامان	۷۵/-
کھالیں	۱/۷	معدنیات اور ایندھن	۴۱/۱
مچھلی	۷/۳	تیل اور چربی	۲۹/۴
چمڑا	۱۵/-	متفرقات	۳۹/۴
چاول	۱۷/۳		
متفرقات (زیادہ تر زرعی اجناس)	۱۰۹/۳		
میزان	۳۲۴/۹	میزان	۵۱۷/۷

ب۔ علاقوں کی رو سے

(کروڑ روپوں میں)

	برآمدات	درآمدات
شمالی امریکہ	۴۲/۱	۱۷۳/۴
وسطی امریکہ	۰/۸	صفر
جنوبی امریکہ	۷/۷	۰/۲
مغربی یورپ	۸۰/۲	۱۶۱/۷
مشرقی یورپ (بشمول روس)	۴۷/۱	۴۶/۲
مشرقِ وسطیٰ	۳۳/۹	۳۷/۰
افریقہ	۱۹/۴	۲/۰
ایشیا	۸۴/۹	۹۰/۹
اوشنیا	۸/۸	۶/۳
میزان	۳۲۴/۹	۵۱۷/۷

چارٹ نمبر ۱ سے دو بنیادی نتیجے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہماری بیرونی تجارت کا بڑا حصہ سامراجی ممالک کے ساتھ ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہم ان سامراجی ممالک سے مصنوعات خریدتے ہیں اور خام مال اور غذا یا حد سے حد ان ملکی صنعتوں کی مصنوعات بیچتے ہیں جو سرمایہ دار ملکوں کی ترقی یافتہ بنیادی صنعتوں کی براہِ راست دُم چھلہ ہوتی ہیں

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اس قسم کے چارٹوں سے اس بات کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ ہماری بیرونی تجارت کا کردار کس قدر غیر مساوی ہے۔ ان چارٹوں سے یہ ہرگز ہرگز ظاہر نہیں ہو سکتا کہ پاکستان اپنا مال دوسرے ممالک کے ہاتھوں کتنے سستے داموں پر بیچتا ہے یا پاکستان کو اپنا مال کتنے سستے داموں پر بیچنا پڑتا ہے اور نہ ہی یہ بات ظاہر ہو سکتی ہے کہ پاکستان کو سامراجی ممالک کی مصنوعات کس قدر مہنگے داموں خریدنا پڑتی ہے۔ تجارت کا یہ غیر مساوی کردار کسی طریقے سے بھی ان چارٹوں کے ذریعے نہیں معلوم ہو سکتا۔ عالمی منڈی کی قیمتوں کی اپنی مرضی کے تابع کر کے سامراجی طاقتیں ہمارے محنت کشوں کے پیدا کردہ مال کی بڑی مقدار کو ہتھیا کر اس کے بدلے میں پاکستان کو مشینری اور صنعتی مصنوعات کی ناقابلِ ذکر مقدار دیتی ہیں۔ یہ مشینریاں وغیرہ بھی اکثر و بیشتر خراب اور متروک ہوتی ہیں اور پاکستان کی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل نہیں ہوتی ہیں۔ ہمارے

یحییٰ خان ۱۹۷۱ء میں سکّے میں کمی کرنے پر تیار ہو گیا تھا

محنت کش عوام کے پیدا کردہ مال کی بڑی مقدار کے بدلے میں کم تعداد میں خراب اور متروک مشینری اور صنعتی مصنوعات دینے سے سارے محنت کش عوام پر مزید بوجھ پڑتا ہے اور ان کا استحصال شدید ہو جاتا ہے۔

مالیاتی سرمائے کی بہت ہی بڑی مقدار سرکاری اور نجی، دونوں سیکٹروں میں براہ راست سرمایہ لگانے کی اور پاکستان میں سیلاب کی طرح آنے والے سامراجی قرضے اور سامراجی "امداد" کی شکل میں ہے۔ اس سے قطع نظر اس چارٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساری برآمدات کا ایک بہت بڑا حصہ خام مال، غذاؤں اور عمدہ کئے ہوئے اور نیم عمدہ کئے ہوئے خام مال پر مشتمل ہے۔ اس خام مال کو یعنی پٹ سن، روئی، چمڑے وغیرہ کو پاکستان میں عمدہ کئے جانے یا نیم عمدہ کئے جانے کی اجازت بھی اس وجہ سے دی جاتی ہے۔ کیوں عمدہ کرنے یا نیم عمدہ کرنے والی صنعتوں میں غیر ماہر یا نیم ماہر مزدوروں کی ضرورت ہوتی ہے جو یورپ اور امریکہ کی بہ نسبت پاکستان میں بہت کم اجرت پر مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس قسم کی صنعتیں عالمی سامراجی صنعتی کامپلکس کی ذیلی صنعتیں ہوتی ہیں اور ان ذیلی صنعتوں میں بھی کچھ سرمایہ سامراجیوں کا لگا ہوتا ہے اور کچھ سرمایہ گماشتہ سرمایہ داروں کا لگا ہوتا ہے اسی طرح درآمدات کا اس سے بھی زیادہ بڑا حصہ بڑی مصنوعات (مشینری) پر (جو سامراجی مالیاتی سرمائے کی دوسری شکل ہے) مشتمل ہوتا ہے یا نیم عمدہ کئے ہوئے مال (تیل، چربی، کیمیائی اشیاء) اور ایسے دوسرے مال پر مشتمل ہوتا ہے جو سامراجیوں کی قائم کردہ یا سامراجیوں کی مدد سے قائم کردہ صنعتوں کو چلانے کے لئے ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ درآمدات کا ایک حصہ لیکن چھوٹا سا حصہ اشیائے صرف (تیار مال، غذا، مویشی وغیرہ) پر مشتمل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیار مال میں جو ہماری اجناس کی منڈی میں صرف اور استعمال کے واسطے بیچی جاتی ہیں۔ اس طرح سے صرف بیرونی تجارت کی اقسام کا تجزیہ کرتے ہی ہماری معاشیات کا نیم نوآبادیاتی کردار واضح ہو جاتا ہے اور یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ پاکستان پر سامراجی بالخصوص امریکی سامراجی استحصال کس قدر شدّت سے ہو رہا ہے۔

سامراجی طاقتوں نے پاکستان کو معاشی طور پر غلام بنا دیا ہے۔ اس استحصال میں زمیندار طبقہ پاکستان کے اندر سامراجی طاقتوں کے لئے سماجی بنیاد ہے اور نوکر شاہی، گماشتہ سرمایہ دار طبقہ سامراجی طاقتوں کا دلّال اور حلیف ہے۔ اس معاشی غلامی نے ہمارے سماج کی پیداواری قوتوں کے فروغ میں روڑے اٹکا دیئے ہیں اور ملک کو پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ ریاست بنا دیا ہے۔

سامراج آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔ اپنے خاتمے کے اس مرحلے پر اس کے دیوالیہ پن اور رجعت پرستانہ فطرت نے اُسے ایسے گھمبیر مسائل کی جکڑ بندیوں میں پھانس دیا ہے جن کو وہ حل کرنے پر قادر نہیں ہے اور سامراج پر سخت ترین معاشی بحرانوں کی کیفیت مستقل طور پر طاری ہے۔ بین الاقوامی مالی بحران سامراج کے سخت ترین معاشی بحران کا عکس اور اس کا حصہ ہی ہے۔ اس بین الاقوامی سامراجی معاشی تنصیبات ہونے کی حیثیت سے پاکستانی معاشیات کو بھی سامراجی معاشیات کے ساتھ ساتھ ان بحرانوں سے گزرنا پڑتا ہے اور ان بحرانوں سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ پاکستان کو اس کے علاوہ ان بحرانوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے اور ان بحرانوں سے بھی نقصان اٹھانا پڑتا ہے جو پاکستان میں اس وجہ سے اٹھتے ہیں۔ کیونکہ پاکستان کی معیشت ایسے پس ماندہ، نیم جاگیردارانہ اور غیر ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ملک کی معیشت ہے جس کو سامراج نے معاشی طور پر لوٹا ہے اور غلام بنا لیا ہے۔ پاکستان کی نیم نوآبادیاتی حیثیت ہونے کی وجہ سے سامراج کا پاکستان پر مالی دباؤ اور قبضہ ہے اور پاکستان کی یہ نیم نوآبادیاتی حیثیت سامراجیوں کو ہمارے ملک کا استحصال کرنے میں مدد دیتی ہے۔

اس طرح سے سکے کا بحران پاکستان کے ماضی کا مستقل خصوصیت رہا ہے اور اب بھی ایسا ہی ہے۔ اس بات کا اظہار اس حقیقت سے ہو جاتا ہے کہ ۱۹۵۴ء میں پاکستانی سکّے کی قیمت میں کمی کے بعد چار سال کے اندر اندر سامراجیوں نے حکومت پاکستان پر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ اپنے سکّے کی قیمت کو کم کر دے۔ اس وقت ایوب حکومت تھی۔ اس حکومت نے گماشتہ سرمایہ دار کے نمائندے کی حیثیت سے سامراجیوں کے اس دباؤ کی بہت کمزوری کے ساتھ مخالفت کی تاکہ وہ لوٹ میں اپنا حصہ برقرار رکھ سکے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس نے اپنے سامراجی آقاؤں کے ساتھ فرماں بردار غلاموں کا سا رویہ رکھا ایوبی حکومت نے معاشی اور سکّے کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کچھ دوسرے اقدامات کئے۔ مثلاً بونس واؤچر اسکیم کا جاری کرنا جس کے ذریعے سے اُسے امید تھی کہ برآمدات بڑھ سکے گی اور اس طرح سے زیادہ ڈالر کمائے جا سکیں گے۔

ایوب حکومت کی یہ اسکیم اور اس کے دوسرے اقدامات ناکام رہے، ملک کی معاشی حالت گرتی ہی رہی۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۸ء تک چار سال کی مندرجہ ذیل اعداد و شمار زر مبادلہ کی کمائی کے لحاظ سے پاکستانی معاشی حالت کے خراب ہونے کی حدود کی نشان دہی کرتی ہیں۔

کروڑ روپوں میں

ا۔ حکومت پاکستان کی کمائی

	برآمدات	۱,۱۸۶

ب۔ ادائیگیاں

(الف)	درآمدات	۱,۹۰۵
(ب)	سامراجی ملکوں کو منافع جات بھیجنا	۵۳
(ج)	قرضوں کی ادائیگی	۱۷۹
		۲,۰۳۷

فرق ـــــ ۸ ارب ۵۱ کروڑ روپے

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ زر مبادلہ کی کمائی کے لحاظ سے اب تک پاکستان میں

عالمی منڈی میں ہمارے محنت کشوں کی محنت سستے داموں بک جاتی ہے

برسر اقتدار حکومتوں کو کس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ عالمی منڈی میں پاکستانی اشیاء کی قیمتوں میں مسلسل کمی اور سامراجی ملکوں کی بنی ہوئی مصنوعات کی قیمتوں میں مسلسل اضافے (جو مندرجہ ذیل چارٹ ۲ میں دیا گیا ہے) کی وجہ سے قرضوں کی ادائیگی کے بوجھ کی وجہ سے، اور بہت بھاری منافع کے اس بوجھ کی وجہ سے جو سامراجی اجارہ داریاں زبردستی حاصل کرتی ہیں۔ پاکستان میں ہمیشہ

سامراجی طاقتوں نے پاکستان کو معاشی غلام بنالیا

ڈالر کی کمی رہی ہے۔

چارٹ نمبر ۲

پاکستانی درآمدات اور برآمدات کے لئے عالمی سرمایہ دار منڈی میں قیمتوں کا رجحان

۶۱ ـ ۱۹۶۰ = ۱۰۰

سال	برآمدات	درآمدات
۵ ـ ۱۹۶۴ء	۸۸/۱	۱۱۴/۵
۶ ـ ۱۹۶۵ء	۹۲/۱	۱۱۱/۱
۷ ـ ۱۹۶۶ء	۱۰۳/۲	۱۱۴/۱
۸ ـ ۱۹۶۷ء	۹۴/۹	۱۱۴/۹
۹ ـ ۱۹۶۸ء	۹۴/۳	۱۱۶/۰
۷۰ ـ ۱۹۶۹ء	۹۳/۲	۱۲۲/۲
۷۱ ـ ۱۹۷۰ء	۹۵/۱	۱۲۳/۸

مندرجہ بالا چارٹ یہ بتاتا ہے کہ اوسطاً پاکستانی برآمدات کی قیمتوں میں تقریباً ۵ فی صدی کمی آئی۔ جب کہ درآمدات کی قیمتوں میں تقریباً ۲۴ فی صد اضافہ ہوگیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اشیاء جو پاکستان باہر کے ملکوں کو بھیجتا تھا اوسطاً ان کی قیمتوں میں پانچ فی صد کمی ہوگئی۔ ۶۱ـ۱۹۶۰ء میں پاکستان جو چیز ۱۰۰ روپے میں باہر کے ملکوں میں فروخت کرتا تھا اب وہی چیز ۷۱ ـ ۱۹۷۰ء میں ۹۵ روپے میں فروخت کرنے پر مجبور ہے اور ۶۱ـ۱۹۶۰ء میں جو مصنوعات پاکستان سامراجی ممالک سے ۱۰۰ روپے میں لیتا تھا۔ اب وہی مصنوعات ۷۱ ـ ۱۹۷۰ء میں ۱۲۴ روپے میں خریدتا ہے۔ اس طرح سامراجیوں سے تجارت میں صرف اشیاء کی قیمتوں کے تعین میں پاکستان کو تیس ۳۰ فی صدی سے زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔

اس چارٹ سے یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ سرمایہ ملکوں سے جو مصنوعات درآمد کی جاتی ہیں ان کی قیمتوں میں کس طرح سے مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور پاکستان سے برآمدات کی اشیاء کی قیمتوں میں کس طرح سے مسلسل کمی ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود اس چارٹ سے ۶۱ ـ ۱۹۶۰ء کی نسبت سے ہی درآمدات کی قیمتوں میں اضافہ اور برآمدات کی قیمتوں میں کمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس چارٹ سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ سامراجی ملکوں سے بیرونی تجارت میں ہمارا واقعی استحصال محنت کے گھنٹوں کے لحاظ سے کس قدر بھیانک ہو رہا ہے۔

پاکستان کو ڈالر کی ضرورت رہتی ہے کیونکہ عالمی سرمایہ دارانہ منڈی میں پاکستانی روپیہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ عالمی سرمایہ دارانہ منڈی ہی سے پاکستان کو اپنی معیشت برقرار رکھنے کے لئے مصنوعات خریدنا پڑتی ہیں۔ اس کے علاوہ سامراجی حکومتیں، بین الاقوامی مالیاتی ادارے مثلاً بین الاقوامی مالیاتی فنڈ، اور عالمی بنک اور اجارہ داریں، اپنے قرضوں، سود اور منافع جات کی ادائیگی ڈالر میں ہی طلب کرتے ہیں اس لئے کہ یہ سامراج کی طرف سے مسلط کردہ بین الاقوامی سکہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں ڈالر کی ضرورت بڑھتی ہی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ ضرورت بہت شدید ہو جاتی ہے اور پھر سکے کا بحران اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ حکومت پاکستان اس بحران پر قابو پانے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے اور کون سے اقدامات کرتی ہے؟ اپنے گماشتہ کردار کی مناسبت سے یہ سامراجیوں سے مزید قرضوں کی بھیک مانگتی ہے۔ یہ بات بھی خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ سامراجی امداد ملک کے اندر برسراقتدار طبقوں کو فائدہ پہنچاتے ہوئے بھی ہر صورت میں نوآبادیاتی اور نیم نوآبادیاتی ممالک کے عوام کے استحصال کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔

فروری ۱۹۷۱ء میں سکے کا بحران اس قدر شدید ہو گیا تھا کہ یحییٰ خان نے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کو مطلع کیا تھا کہ وہ پاکستانی سکے کی قیمت میں کمی کرنے کو تیار ہے۔ بشرطیکہ اس کے بدلے میں ڈالر کا قرضہ دے دیا جائے۔ لیکن یحییٰ خان کی پیش کردہ شرائط سامراجیوں کو منظور نہ تھیں۔ اس کے علاوہ ملک میں سیاسی بحران اور اس سے پیدا شدہ غیر یقینی صورت حال کی وجہ سے سامراجیوں کو پاکستانی منڈی پر اعتبار نہیں رہا تھا چنانچہ انہوں نے قرضہ دینے سے انکار کر دیا۔ جون ۱۹۷۱ء میں یحییٰ خان نے دوبارہ مالیاتی فنڈ کو لکھا اور پہلے سے زیادہ بہتر شرائط پیش کیں۔ لیکن اُس وقت تک بین الاقوامی مالیاتی فنڈ نے دیکھ لیا کہ اسے صرف وقت کا انتظار کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ جلد یا بدیر پاکستان کے برسراقتدار طبقے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کی شرائط منظور کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس وجہ سے ایک مرتبہ پھر قرضے کی درخواست مسترد کر دی گئی۔

چنانچہ سامراجیوں کی شرائط پر پاکستانی سکے کی قیمت میں کمی کرنے کا کام پیپلز پارٹی کی حکومت کی قسمت میں پڑا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت نے سامراجیوں کی شرائط پر پاکستانی سکے کی قیمت میں کمی کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ یہ کمی "زرمبادلہ کی اصلاحات" میں سے اور ایک ایسا قدم ہے جو دولت کی بہتر تقسیم کے ذریعے منصفانہ سماج کے قیام میں مددگار ہوگا۔"

پاکستان پیپلز پارٹی جاگیرداروں اور گماشتہ طبقوں کی سیاسی نمائندہ ہے اور سامراج نواز ہے۔ اس کی حکومت خواہ کچھ بھی دعوے کرے لیکن اس کے دعوؤں کے بالکل برخلاف زرمبادلہ کی شرح میں ۱۳۱ گنا کمی، سکے کی قیمت میں کمی کی وجہ سے مندرجہ ذیل فوری اثرات ہوں گے۔

۱۔ دوگنے سے زیادہ اجناس، کپڑے میں دوگنے سے زیادہ گزوں اور غلے میں دوگنے سے زیادہ ٹنوں کو برآمد کیا جائے گا تاکہ اتنے ہی ڈالر کمائے جاسکیں جتنے کہ سکے کی قیمت میں کمی سے پہلے جاتے تھے۔ مثلاً سکے کی قیمت میں کمی سے پہلے سو گز کپڑے میں جتنے ڈالر کمائے جاتے تھے۔ اب اتنے ہی ڈالر ۲۳۱ گز کپڑے کے عوض کمائے جائیں گے۔ اسی طرح سکے کی قیمت میں کمی سے پہلے ۱۰۰ ٹن اناج سے جتنے ڈالر کمائے جاتے تھے اب سکے کی قیمت میں کمی کے بعد اتنے ہی ڈالر کمانے کے لئے ۲۳۱ ٹن اناج بھیجنا پڑے گا۔

۲:۔ درآمد شدہ مصنوعات پر ڈالر کے اخراجات اتنے ہی رکھنے کے لئے جتنے کہ سکے کی قیمت میں کمی سے پہلے تھے۔ آدھی سے بھی کم مشینری یا مصنوعات وغیرہ درآمد کی جاسکتی ہیں۔ اس لئے کہ مشینری یا مصنوعات جو درآمد کی جارہی ہے اس کی قیمتوں میں دوگنے سے زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں سکے کی قیمت میں کمی سے پہلے اگر ایک لاکھ روپے میں ۲۳۱ مصنوعات درآمد کی جاتی تھیں، تو اب سکے کی قیمت میں کمی کے بعد ایک لاکھ روپے سے صرف ۱۰۰ مصنوعات درآمد کی جاسکتی ہیں۔

سکے کی قیمت میں کمی سے پاکستان کی معیشت کو دوہرا نقصان ہو گیا ہے۔ اگر اس کو بہ نظر غور دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ سکے کی قیمت میں یہ کمی کس قدر بھیانک ہے۔ موجودہ حکومت نے اس کے ذریعے پاکستان کے محنت کشوں کا سامراجیوں کے ہاتھوں کس قدر استحصال کرانے کی چھٹی دی ہے۔ سکے کی قیمت میں کمی سے فوراً پہلے اگر ۱۰۰ پاکستانی اجناس ۱۰۰ سامراجی مصنوعات کے برابر تھیں تو اب سکے کی قیمت میں کمی کے فوراً بعد ۴۳/۳۴ سامراجی مصنوعات ۲۳۱ پاکستانی اجناس کے برابر ہو گئی ہیں۔ یعنی باہمی

باقی صفحہ ۵۸ پر ملاحظہ فرمائیں

غزل

وہ شخص کہ میں جس سے محبت نہیں کرتا
ہنستا ہے مجھے دیکھ کے، نفرت نہیں کرتا

پکڑا ہی گیا ہوں تو مجھے دار پہ کھینچو!
سچا ہوں مگر اپنی وکالت نہیں کرتا

کیوں بخش دیا مجھ سے گنہگار کو مولا
منصف تو کسی سے بھی رعایت نہیں کرتا

گھر والوں کی غفلت پہ سبھی کوس رہے ہیں
چوروں کو مگر کوئی ملامت نہیں کرتا

کس قوم کے دل میں نہیں جذبات براہیم
کس ملک پہ نمرود حکومت نہیں کرتا

دیتے ہیں اجالے مرے سجدوں کی گواہی
میں چھپ کے اندھیرے میں عبادت نہیں کرتا

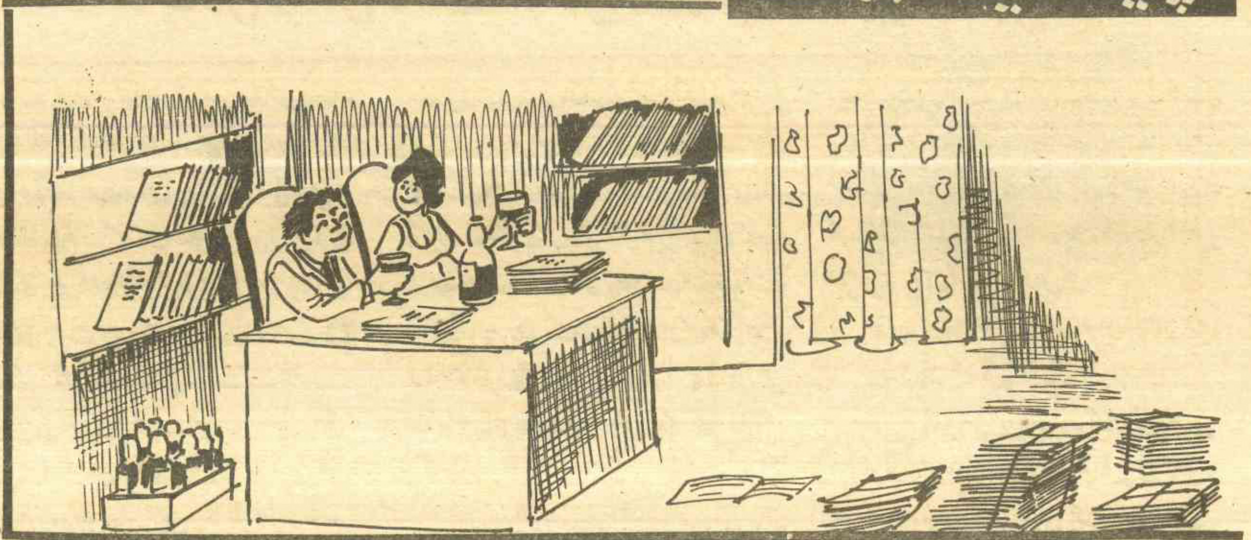
بھولا نہیں میں آج بھی آدابِ جوانی
میں آج بھی اوروں کو نصیحت نہیں کرتا

انسان یہ سمجھیں کہ یہاں دفن خدا ہے
میں ایسے مزاروں کی زیارت نہیں کرتا

دنیا میں قتیلؔ اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا!

قتیل شفائی

چین سے ایک کھلا خط



سفارتخانے کے سارے اونٹ بے مہار پھر رہے ہیں

احفاظ الرحمان

ارشاد راؤ!

میں اس وقت نانکنگ کے "نانکنگ ہوٹل" میں بیٹھا ہوا اپنا آخری مکتوب تحریر کر رہا ہوں۔ میں اسے بہت پہلے ارسال کرنا چاہتا تھا لیکن وقت نہیں ملا، تیاریوں میں الجھا رہا۔ چند دنوں میں پاکستان پہنچ رہا ہوں۔

اس خط کو پڑھ کر تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے سفارتخانوں میں نوکر شاہی کے کارندے پہلے کی طرح آج بھی اپنے مخصوص انداز میں جو انہیں اپنے برطانوی آقاؤں سے ورثے میں حاصل ہوا ہے قومی مفادات کو پامال کر رہے ہیں اور غیر ممالک میں اپنے وطن کی حرمت کو انتہائی سستے داموں فروخت کر رہے ہیں۔

یہ لوگ جو بڑی بڑی تنخواہیں وصول کرتے ہیں اور لمبی لمبی کاروں میں گردن اکڑاتے پھرتے ہیں اس نازک وقت میں بھی پاکستانی عوام کے وقار کو خاک میں ملانے پر تلے ہوئے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ ایسے بے شعور خود غرض اور جاہ پرست افراد غیر ممالک میں پاکستانی قوم کی نمائندگی کر رہے ہیں مشرقی پاکستان کے المیے کے دوران پاکستانی سفارت خانوں کی کارکردگی سب پر ظاہر ہو چکی ہے۔ لیکن سب سے قابلِ مذمت بات یہ ہے کہ اس تلخ تجربے کے بعد بھی نوکر شاہی نے وہی بے ڈھنگی چال اختیار کر رکھی ہے اور موجودہ حکومت بھی عوامی نمائندوں کو نظر انداز کر کے نوکر شاہی کے پٹے ہوئے مہرے کو آگے بڑھا رہی ہے۔ یہ طبقاتی مؤقف کا مسئلہ ہے ؎

"کند ہم جنس با ہم جنس پرواز !"

میں نے بہت پہلے ایک مضمون میں جو "الفتح" کے کسی شمارے میں چھپ چکا ہے یہ لکھا تھا کہ چین میں پاکستان کا سفارت خانہ فلسطینی مجاہدوں کی تنظیم "پی۔ ایل۔ او" کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک کر رہا ہے اور یہ کہ پاکستانی سفارتخانے میں نوکر شاہی کے کارندے فلسطینی مجاہدوں کی تنظیم کے ارکان سے ملنا اپنی توہین سمجھتے ہیں بلکہ انہیں اپنی مطبوعات تک روانہ نہیں کرتے۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے دُکھ ہوتا ہے کہ یہ افسوسناک صورتِ حال اب تک برقرار ہے اور تم نے جو مضمون چھاپا تھا پاکستان کی وزارتِ خارجہ نے اس کا رتی برابر نوٹس نہیں لیا۔ سارے اونٹ بے مہار پھر رہے ہیں کوئی ان کی ناک میں نکیل ڈالنے والا نہیں ہے۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز!

دوسری طرف یہاں بھارتی قونصل خانے کے ارکان پہلے کی طرح اب بھی پوری سرگرمی سے کام کر رہے ہیں اور سفارتی حلقوں میں انتہائی تندہی کے ساتھ اپنے مؤقف کا پرچار کر رہے ہیں۔ وہ فلسطینی مجاہدوں کی تنظیم پی۔ ایل۔ او سے ہمیشہ رابطہ قائم رکھتے ہیں اور اسے مسلسل اپنا لٹریچر بھیجتے رہتے ہیں حالانکہ پی۔ ایل۔ او پاکستانی عوام کی حمایت کو مقدم حیثیت دیتی ہے اور بھارت کے مقابلے میں ہمیشہ عملی طور پر پاکستانی عوام کے مفادات کی حمایت کرتی ہے

اچھی طرح دیکھ لو! قوم کے مفادات کو بیچ چوراہے میں نیلام کر کے پہلے سے بھی شرمناک رسوائیوں کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

چین میں پی۔ ایل۔ او کے نئے سربراہ ابو رایت، جو سات ماہ پہلے یہاں آئے تھے حسبِ سابق، ان سات مہینوں کے دوران پاکستانی سفارت خانے کی طرف سے کسی معمولی سے کارندے نے بھی ان سے رابطہ قائم نہیں کیا اور اب تک اس تنظیم کو پاکستانی سفارتخانے کی طرف سے کوئی ایک ورقی پمفلٹ یا بلیٹن تک موصول نہیں ہوا۔ ابو رایت سات ماہ پہلے یہاں آئے تھے تو انہوں نے اپنی پہلی فرصت میں پاکستان کے سابق سفیر خواجہ محمد قیصر سے ملاقات کی تھی اور پاکستان کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے ان سے محض اس لیے ملاقات کی تھی کہ وہ پاکستان کے سفیر تھے اور چین میں پاکستانی عوام کی نمائندگی

بھارتی قونصل خانے سرگرمی سے اپنا کام کر رہے ہیں

کر رہے تھے لیکن خواجہ محمد قیصر نے سبھی پروٹوکول کے تقاضوں کو بھی پورا نہیں کیا، اور ایک بار بھی ان سے جوابی ملاقات کرنے نہیں گئے۔ اسی طرح الورایت ایک بار اپنی بیوی کے ساتھ سفارت خانے کے سابق منسٹر مسٹر جعفری سے ملاقات کرنے گئے۔ لیکن خواجہ محمد قیصر کی طرح مسٹر جعفری نے بھی انہیں کوئی اہمیت نہیں دی اور پاکستانی عوام کے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے ان سے جوابی ملاقات کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ جب چینی حکومت کے متعلقہ شعبے نے مسٹر جعفری کے اعزاز میں الوداعی پارٹی دی تو الورایت کو بھی مدعو کیا اور وہ اس تقریب میں حاضر تھے۔ خواجہ محمد قیصر جب پاکستان جانے کے بہانے یہاں سے رخصت ہوئے تو الورایت آدھی رات کو انہیں ہوائی اڈے پر الوداع کہنے گئے۔ نئے سفیر آغا شاہی وارد ہوئے تو ایک بار پھر الورایت آدھی رات کو ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے ہوائی اڈے پر موجود تھے۔

اس سلسلے میں ایک عبرت انگیز واقعہ بھی سن لو! جب وہ آغا شاہی کا خیر مقدم کرنے ہوائی اڈے پر گئے تو انہوں نے پاکستانی سفارت خانے کے ایک افسر سے جو اس وقت یہاں تیسرے کلیدی عہدے پر فائز ہیں، اس بات کا گلہ کیا کہ پاکستانی سفارت خانے نے فلسطینی مجاہدوں کی تنظیم سے ایک بار بھی

پاکستانی سفارتخانے کے ایک سفارتی افسر کو فلسطینی مشن کے دفتر کا پتہ نہ تھا

رابطہ قائم نہیں کیا۔ افسر مذکور نے کہا ——— "ہمارا پرانا اسٹاف (بنگالی) اچھا نہیں تھا۔ اب یہ لوگ جا چکے ہیں اس لیے ہمارے تعلقات کو اور زیادہ استحکام حاصل ہوگا....

.... اچھا! پیکنگ میں آپ کے مشن کا دفتر کہاں ہے؟"

انہیں اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ فلسطینی مشن کا دفتر پیکنگ میں کس جگہ ہے۔

بہر حال "پرانا اسٹاف،، جا چکا ہے اور اس کی جگہ نئے افسر بھی آ چکے ہیں لیکن حالات جوں کے توں ہیں۔ ان سفید پوشوں کے رویے میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں آئی جب کوئی نیا سفیر کسی ملک میں آتا ہے تو وہ مختلف ممالک کے سفارتی نمائندوں سے ملاقات کرتا ہے لیکن آغا شاہی کی آمد کے بعد بھی الورایت کو نہ تو کبھی پاکستانی سفارت خانے میں آنے کی دعوت دی گئی۔ اور نہ کبھی ان کے مشن میں جا کر ان سے ملاقات کرنے کی کوشش کی گئی۔ آغا شاہی کی آمد کے دو دن بعد سفارت خانے کی طرف سے ایک ضیافت کا اہتمام کیا گیا تمام ممالک کے سفارتی نمائندوں کو مدعو کیا گیا لیکن الورایت کو نظر انداز کر دیا اور یہ وہی الورایت تھے جو آدھی رات کو جناب آغا شاہی کا خیر مقدم کرنے کے لیے ہوائی اڈے پر گئے تھے!

اس کے برعکس جب الورایت اپنی بیوی کے ساتھ بھارتی قونصل سے ملاقات کرنے گئے تو وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ ان سے جوابی ملاقات کرنے کے لیے ان کے مشن میں گیا۔ اب یہ بھی دیکھو کہ فلسطینی عوام پاکستان کے عوام کے مفادات کا کس طرح خیال رکھتے ہیں۔ بھارتی سفارت خانے میں بنگلہ دیش کے بارے میں ایک فلم دکھائی جا رہی تھی، الورایت کو بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن وہ یہ فلم دیکھنے نہیں گئے۔ چند دن بعد ایک اور شو ہوا لیکن انہوں نے جانے سے پھر انکار کر دیا۔

پاکستانی سفارتخانے کے قونصلر بختیار علی نے بھی یہاں آنے کے بعد ایک بار بھی فلسطینی تنظیم کے ارکان سے ملاقات نہیں کی۔ اس قسم کا رویہ ہمیں دوستوں سے محروم کرتا ہے اور دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرتا ہے کیونکہ دوستی ہمیشہ دو طرفہ ہوتی ہے فلسطینی مجاہدوں کی تنظیم پی ایل۔ او کے ارکان کاٹھ کے الّو نہیں ہیں کہ کسی کے آگے سر جھکا کر دوستی کی بھیک مانگتے پھریں۔ وہ دو طرفہ تعلقات کے حامی ہیں اور کسی کے آگے سر جھکانا نہیں جانتے۔ چنانچہ جب الورایت کی بچی کو بختیار علی کی بچی نے جو اس کے ساتھ پڑھتی ہے (الورایت کے دونوں بچے پاکستانی سفارتخانے کے اسکول میں پڑھتے ہیں۔ حالانکہ یہاں دوسرے سفارتخانوں کے اسکول بھی موجود ہیں) اپنی سالگرہ کی تقریب میں مدعو کیا اور اس نے اپنے والد سے اس تقریب میں شرکت کرنے کی اجازت طلب کی تو الورایت نے اسے منع کر دیا اور کہا کہ وہاں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سماجی تعلقات دو طرفہ بنیاد پر استوار ہوتے ہیں اگر یہ تعلقات یکطرفہ ہیں تو گویا وہ ہمارے آقا ہیں فلسطینی کبھی کسی کو اپنا آقا تسلیم نہیں کریں گے

اردن کے "سیاہ ستمبر" کے قتل عام میں پاکستان کے تین افسر بھی ملوث تھے۔ فلسطینی تنظیم کے ارکان کو ان کے نام تک معلوم ہیں لیکن اس کے باوجود وہ پاکستان سے نفرت نہیں محبت کرتے ہیں۔ کیونکہ پاکستان گلی سڑی نوکر شاہی کا نہیں پاکستانی عوام کا ملک ہے وہ پاکستانی عوام پر اعتماد کرتے ہیں اور انہی کی حمایت پر انحصار کرتے ہیں۔

یہاں دو نکتے زیر غور ہیں۔ پہلا نقطہ یہ ہے کہ جب ہمارے عوام فلسطینی عوام کی جدوجہد کے لیے اپنے لہو کا نذرانہ پیش کرنے کو تیار ہیں تو پھر ہمارے سفارت خانوں (مجھے یقین ہے کہ ہمارے سفارت خانے ہر ملک میں یہی منفی کردار ادا کر رہے ہیں کیونکہ ان پر نوکر شاہی کا اجارہ ہے) کے عالی مرتبت افسروں کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ غیر ممالک میں فلسطینی تنظیموں کے اراکین کے ساتھ سوتیلی ماں کا سلوک کریں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جب یہ بات سفارت خانوں کے بنیادی فرض میں داخل ہے کہ وہ غیر ممالک میں زیادہ سے زیادہ لوگوں سے رابطہ قائم کریں، انہیں اپنا دوست بنائیں، ان کے اندر اپنے ملک کا پروپیگنڈا کریں اور انہیں اپنی مطبوعات پہنچاتے رہیں تو پھر ایک عظیم المیہ سے دوچار ہونے کے بعد بھی ہمارے سفارتخانے اس کام کو کوئی اہمیت کیوں نہیں دے رہے ہیں اور دوست حلقوں کو اپنی مطبوعات بھیجنے سے چشم پوشی کیوں کر رہے ہیں یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس سے نوکر شاہی کے منفی کردار کی پوری طرح ترجمانی ہوتی ہے۔ اور امور خارجہ کے "چمپئن" صدر کے دور میں ڈپلومیسی کے عام فہم تقاضوں کو بھی پورا نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس رویے کو وطن دشمنی کے علاوہ اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ آخر انہیں یہ حق کس نے دیا ہے جو گنتی کے چند مفاد پرستوں کے ذریعے ملک کی غالب اکثریت کا استحصال کرتا ہے۔

وطن کے محنت کشوں سے پوچھو، دانشوروں اور نوجوانوں سے پوچھو وہ اس گلے سڑے نظام کے حامیوں کا تسلط کب تک برداشت کریں گے؟



شیر علی جواب دو

ہم نہ کہتے تھے کہ گردشِ دوام سے ڈرو
بازآؤ، انقلابِ لالہ فام سے ڈرو
ہم نہ کہتے تھے جنوں کے انتقام سے ڈرو
اے شریرِ وقت! اس سوال کا جواب دو

شیر علی حساب دو

قید تم ستم شعار اپنی ہی ہوس میں ہو
کل تمہارے بس میں ہم تھے، اب ہمارے بس میں ہو
جس قفس میں ہم تھے آج تم اسی قفس میں ہو
اے شریرِ وقت! اس سوال کا جواب دو

شیر علی حساب دو

جرمِ اختیار کی لڑی ہے تیرے ہاتھ میں
کل جو تیرے حکم سے پڑی ہے میرے ہاتھ میں
آج دیکھ لے وہ ہتھکڑی ہے تیرے ہاتھ میں
اے شریرِ وقت، اس سوال کا جواب دو

شیر علی جواب دو

شیر علی کو چھوڑ دو

ہیں افق افق ہماری بات بات کے علم!
ہم ہیں صاحبِ قلم، ہم ہیں صاحبِ قلم
سادہ کار و سادہ دل ہیں منتقم نہیں ہیں ہم
ظلم کی گھناؤنی روایتوں کو توڑ دو!

شیر علی کو چھوڑ دو

گرچہ یہ گناہگار ہے جفا شعار ہے
ابتدا سے سازشیں ہی اس کا کاروبار ہے
دشمنِ عوام ہے، اشقی ہے، نابکار ہے
ظلم کی گھناؤنی روایتوں کو توڑ دو!

شیر علی کو چھوڑ دو

اس نئے نظام میں ہے اس کی موت کا پیام
اس کو چھوڑ دو کریں گے لوگ اس کا انتظام
چھوڑ دو اسے عوام لیں گے اس سے انتقام
ظلم کی گھناؤنی روایتوں کو توڑ دو

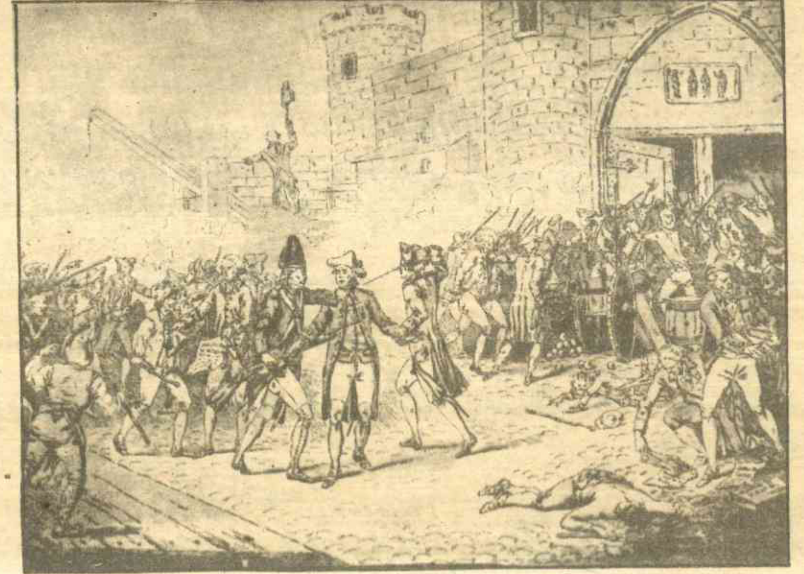
شیر علی کو چھوڑ دو

فارغ بخاری

عوام نے انقلابِ فرانس کا خاکہ سڑکوں پر تیار کیا

انقلابِ فرانس نے تاریخ انسانی کا رُخ موڑ دیا

نعیم الحسن



۱۲ جولائی ۱۷۸۹ء کا دن ہے۔

پیرس نئے خواب کی تعبیر ڈھونڈ رہا ہے۔ عوام جمہوری حقوق کی بحالی کے لئے سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ پیرس کی گلیوں، سڑکوں کیفے اور ریستورانوں میں گرماگرم بحثیں جاری ہیں۔ کنگ لوئیس شانز دہم نے اپنے ایک وزیر مالیات "نیکر" کو برطرف کردیا۔ جو پیرس میں بے حد مقبول تھا۔ شاہ کی نیت نیک نہ تھی۔ وہ عوام کو ایسے جمہوری حقوق دینے کے لئے کسی طرح بھی آمادہ نہ تھا جس سے اس کا اقتدار خطرے میں پڑجاتا۔ اس کا نعرہ تھا "بادشاہ حکمرانی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔"

عوام کا نعرہ تھا "آزادی، مساوات اور خوش حالی۔"

روسو نے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے پیغام دیا۔

"انسان آزاد پیدا کیا گیا۔ مگر زمین پر اس کے پاؤں میں بیڑیاں پہنادی گئیں۔ توڑدو ان بیڑیوں کو۔"

پیرس کے عوام کے خلاف لوئیس شانز دہم جاگیردار اور شرفاء کی جماعت سازشیں کررہی تھی۔ بادشاہ قومی اسمبلی کو توڑنا چاہتا تھا۔ جس کے ذریعہ عوام نے بادشاہ کے لامحدود اختیارات کو محدود کردیا تھا اور کچھ جمہوری حقوق حاصل کرلئے گئے تھے۔ اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے برطانوی سفیر نے لکھا۔

"ہم یہ بات آسانی سے دیکھ سکتے ہیں کہ فرانس ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے اُبھر رہا ہے۔ بادشاہ کے لامحدود اختیارات محدود ہوچکے ہیں۔ اور اس کے درجے کو قومی سطح پر کھینچ لایا گیا ہے۔"

پیرس کی چند ممتاز شخصیتوں اور قانون دانوں نے جمہوری حقوق کی بحالی کے لئے جدوجہد شروع کردی۔ انہوں نے حلف اٹھایا کہ وہ مستحکم بنیادوں پر دستور تیار کریں گے۔ اسمبلی نے اس بات کا اعلان کیا کہ انتخابات اور ٹیکسوں کی وصولی کے معاملے میں وہ آزاد ہو گی۔ کسی طرح بھی بادشاہ کا دباؤ قبول نہیں کیا جائے گا۔ قومی اسمبلی

قلعہ باسٹل کا گورنر عوامی یلغار کو روکنے میں ناکام ہوگیا

کے ان فیصلوں نے بادشاہ کی مطلق العنانی پر کاری ضرب لگائی تھی۔ لوئیس کو مجبوراً ان جمہوری فیصلوں کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ اُس نے نیم دلانہ اپنے ماتحتوں کو احکامات صادر کئے کہ وہ ان فیصلوں کی پابندی کریں۔

بادشاہ کے خلاف فرانس کے اُبھرتے ہوئے "بورژوائی طبقے" کی یہ پہلی کامیابی تھی جو کا غذ پر ایک انقلاب کی صورت میں جنم لے چکی تھی۔ ۹ جولائی کو قومی اسمبلی کو دستور ساز اسمبلی کی حیثیت میں تبدیل کرنے کا اعلان کیا گیا۔ لوئیس نے بظاہر عوامی حاکمیت کو قبول کرلیا تھا۔ مگر اندرون خانہ وہ اپنے اقتدار، حاکمیت، مطلق العنانی اور جبروقہر کو محفوظ رکھنے کے لئے زبردست توڑ جوڑ اور سازشیں کررہا تھا۔ اُس نے قومی اسمبلی کو توڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اور اس کے لئے جوابی حملے کی تیاری پوری طرح مکمل کرلی گئی تھی۔ لوئیس نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے غیر ملکی فوجی دستے منگوائے تھے۔ جن پر وہ آنکھ بند کرکے اعتماد کرسکتا تھا۔ اُس نے دوسرا کام یہ کیا کہ مالیات کے ڈائریکٹر جنرل نیکر کو برطرف کردیا۔ اس کی جگہ شاہی خاندان کے ایک وفادار شخص "بیرن ڈی بریٹیول" کو حکومت تشکیل دینے کا حکم دیا۔ طاقت کے اس استعمال سے اسمبلی میں سراسیمگی پھیل گئی۔ انقلاب جو بتدریج ایک واضح شکل اختیار کرتا جا رہا تھا خطرے میں پڑگیا۔ اس آزمائش کی گھڑی میں ہر شخص کی نظریں پیرس پر لگی تھیں۔ ہر شخص کی زبان پر بس ایک ہی نعرہ تھا۔

"فرانس کو بچانے کے لئے پیرس کب اُٹھ کھڑا ہوگا۔"

لوئیس شانز دہم کے اس اقدام سے ایک بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ دربار شاہی سے جمہوری حقوق آسانی سے نہیں ملیں گے۔ اس کے لئے عوام کو جدوجہد کرنی پڑے گی۔ لڑنا ہوگا اور خون بہانا ہوگا۔ انقلاب کا خاکہ اب سڑکوں پر تیار ہونے لگا۔ شہروں میں سیاسی زندگی انقلاب آفریں کروٹ لے چکی تھی۔ عوام ان تمام تبدیلیوں کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ وہ انقلاب کے خلاف بادشاہ اور مٹھی بھر شرفاء کی سازشوں سے نمٹنے کے لئے تیار ہوچکے تھے۔

فرانس کا یہ دور عوامی بیداری کا دور تھا۔ سیاسی، سماجی اور اقتصادی صورت حال ناگفتہ تھی۔ بیروزگاری ایک ایسی بیماری بن چکی تھی کہ جس سے فرانس کا ہر گھر متاثر تھا۔ بھوک مُنہ کھولے ہر طرف رقص کررہی تھی۔ گندم کی قیمت آسمان سے باتیں کررہی تھی۔ عوام بھوکے، ننگے اور بے آسرا تھے۔ شاہی خاندان، جاگیردار اور شرفاء کا مراعات یافتہ طبقہ گلچھرے اڑا رہا تھا۔ ایک طرف فرسودہ جاگیردارانہ نظام کی آہنی گرفت، ظلم و تشدد، شرفاء کی گھناؤنی سازشیں اور معاشی ابتلاء تھی۔ دوسری طرف عوام کا جم غفیر بھوک اور افلاس بھتا، جمہوری حقوق کی پامالی اور سیاسی گھٹن تھی۔

اس سیاسی صورت حال سے فائدہ اٹھاکر فرانس میں اُبھرتے ہوئے بورژوائی طبقہ نے آگے بڑھ کر پیرس کے دکان داروں اور دست کاروں کو شاہی خاندان کے خلاف لڑنے کے لئے آسانی سے منظم کرلیا۔ عوام نے شاہی اقتدار کا خاتمہ کرنے کے لئے اپنے آپ کو مسلح کرنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی جگہ جگہ مظاہرین اور جرمن فوجی دستوں کے درمیان جھڑپیں شروع ہوگئیں۔ پیرس کے بورژوائی طبقے نے نئی میونسپل اور ملیشیا قائم کردی جو بعد میں قومی گارڈ میں تبدیل ہوگئی۔ اس نئے اقدام سے یعنی میونسپلیٹوں کے ذریعہ کئی جگہوں میں مقامی لوگ اقتدار میں آگئے ہیں اور شاہی طاقت کا شیرازہ منتشر ہونے لگا۔

۱۲ جولائی اتوار کے دن پیرس کے ہزاروں افراد نیکر کی برطرفی کے خلاف "قلعہ باسٹل" کے باہر جمع ہوگئے۔ مظاہرین نے جوش غضب میں چلّا کر کہا — "اس طرح عوامی خواہشات کو ٹھکرا کر عوام کی توہین کی گئی۔ یہ بات ہمارے لئے ناقابل برداشت ہے۔"

لوئیس نے عوام کے جذبات کا خون کیا تھا۔ عوام مشتعل تھے



ASSEMBLÉE NATIONALE

Séance du samedi dix neuf Juin 1790

Décret en faveur des Citoyens qui se sont distingués à la prise de la Bastille

PREAMBULE

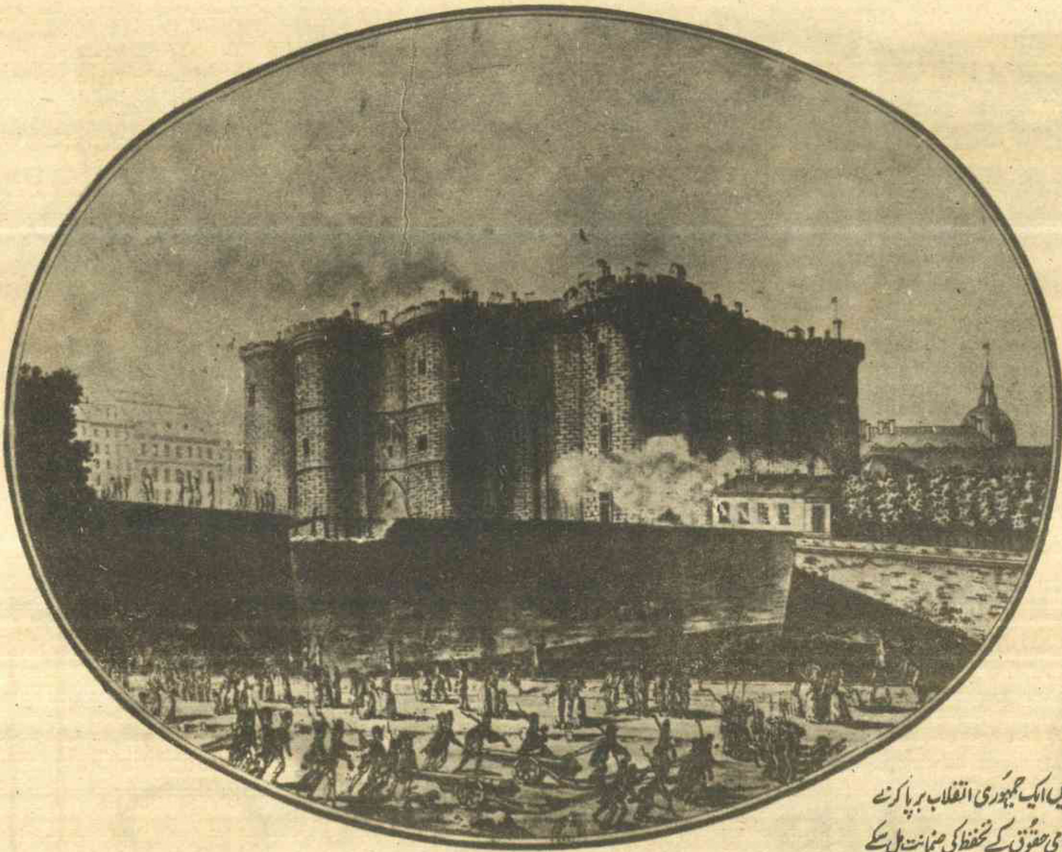
L'Assemblée Nationale frappée d'une juste admiration pour l'héroïque intrépidité des Vainqueurs de la Bastille et voulant donner au nom de la Nation, un témoignage public à ceux qui ont exposé et sacrifié leur vie pour secouer le joug de l'esclavage, et rendre leur Patrie libre.

Décrète qu'il sera fourni aux dépens du Trésor public à chacun des Vainqueurs de la Bastille en état de porter les armes, un habit et un armement complet, suivant l'uniforme de la Nation ; que sur le canon du fusil, ainsi que sur la lame du sabre, il sera gravé l'écusson de la Nation avec la mention que ces armes ont été données par la Nation à tel vainqueur de la Bastille, et que sur l'habit il sera appliqué soit sur le bras gauche, soit à côté du revers gauche, une couronne murale ; qu'il sera expédié à chacun desdits Vainqueurs de la Bastille un brevet honorable pour exprimer leurs services et la reconnaissance de la Nation, et que dans tous les actes qu'ils passeront, il leur sera permis de prendre le titre de Vainqueurs de la Bastille. &c ...... Un brevet honorable sera également expédié aux Vainqueurs de la Bastille qui ne sont pas en état de porter les armes, aux veuves et aux enfans de ceux qui sont décédés, comme monument public de la reconnaissance et de l'honneur dû à tous ceux qui ont fait triompher la liberté sur le despotisme &c... Le tableau remis par les Vainqueurs de la Bastille, contenant leur nom et celui des Commissaires choisis parmi les Représentans de la Commune qui ont présidé à leurs opérations, et qui sont compris dans le présent Décret avec les Vainqueurs, sera déposé aux Archives de la Nation, pour y conserver à perpétuité la mémoire de leur nom et pour servir de base à la distribution des récompenses honorables et des gratifications qui leur sont accordées par le présent Décret.

Nous soussigné Président et Commissaires des Vainqueurs de la Bastille, déclarons et attestons que ... a été reconnu pour l'un des Vainqueurs de la Bastille, dans une assemblée générale légalement convoquée et présidée par les représentans de la Commune de Paris, et par les commissaires nommés pour la vérification des faits et gestes de la Bastille. Nous certifions que conformément au Décret ci-dessus, son nom porté aux procès verbaux et inscrit sur le tableau a été déposé aux archives de l'Assemblée Nationale et qu'en sa qualité de vainqueur de la Bastille il peut et doit jouir des honneurs attachés à ce titre.

Président des Vainqueurs de la Bastille

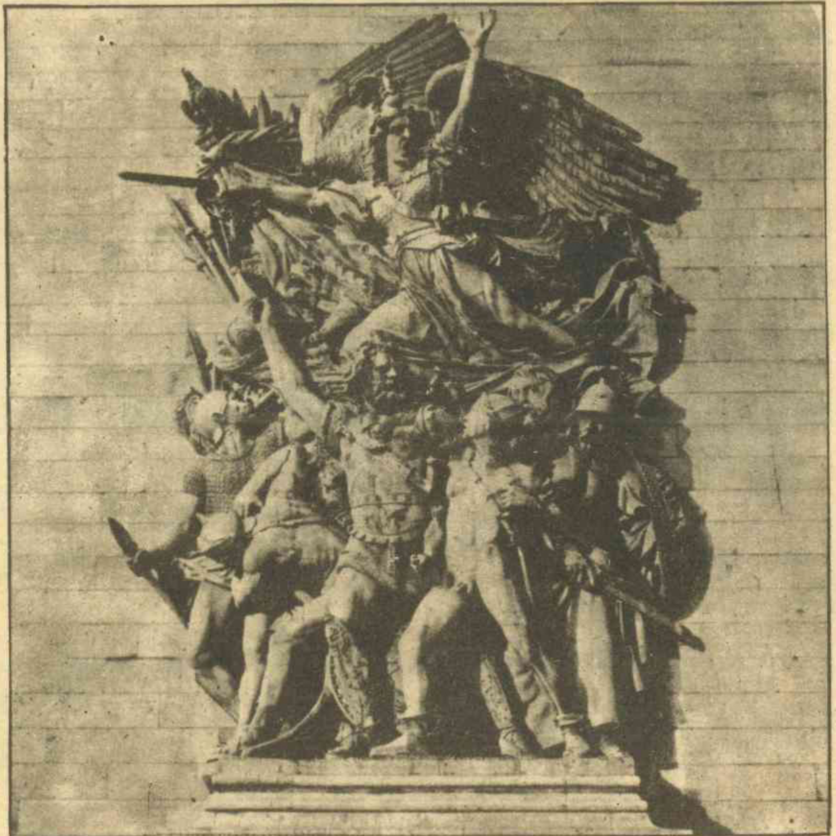
قومی اسمبلی کے تاریخی فیصلے کا عکس



برطانوی سفیر نے کہا:- فرانس ایک نئی تبدیلی کا منتظر ہے۔

اور وہ فرانس کے طول و عرض میں ایک جمہوری انقلاب برپا کرنے کے لئے بے چین تھے۔ جس میں عوامی حقوق کے تحفظ کی ضمانت مل سکے تقریباً پانچ چھ ہزار مظاہرین جلوس کی شکل میں سڑکوں پر نکل آئے پیرس کے ایک چوراہے پر مظاہرین اور رائل جرمن فوجی دستے میں جھڑپ شروع ہو گئی۔ فوجی دستے نے ہدایت ملتے ہی عوام پر حملہ کر دیا۔ مظاہرین اور سپاہیوں میں دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔ اس جھڑپ کے دوران ایک خاص بات رُونما ہوئی جو تاریخ میں اپنا خاص مقام رکھتی ہے۔ فرانسیسی گارڈوں نے عوام سے لڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ غیر ملکی فوجی دستوں سے نفرت کرتے تھے اور وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بھائیوں کا خون بہانا پسند نہیں کرتے تھے۔ مظاہرین اور فوجی دستوں کے درمیان جھڑپ کا سلسلہ دوسرے دن بھی جاری رہا۔ پیرس کے بیروزگار غریب اور مفلوک الحال عوام بھی مظاہرین سے مل گئے اور انہوں نے غلے کے گوداموں اور جیلوں پر حملہ کر کے اناج کی بوریاں لوٹ لیں اور قیدیوں کو رہا کر دیا۔ پیرس میں قانون کی عملداری ختم ہو چکی تھی۔ پورا شہر انارکی کی لپیٹ میں آگیا۔ شاہراہیں، گلیاں اور کیفے سنسان ہو گئے۔ اس صورتِ حال کو ختم کر کے قانون کی حکومت قائم کرنے کے لئے پیرس کے منتخب افراد سٹی ہال میں جمع ہوئے جہاں ۴۸ ہزار افراد پر مشتمل ملیشیا قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

۱۴ جولائی کو صبح چھ بجے شاہراہوں پر ہجوم دوبارہ اکٹھا ہونے لگا۔ شہری خالی ہاتھ تھے۔ جب کہ شاہی دستے کے پاس اسلحہ کا ڈھیر تھا۔ لوگوں نے ہتھیار جمع کرنے کا راستہ نکالا۔ انہوں نے مقامی گورنر کے مکان پر حملہ کر کے اسلحہ لُوٹ لیا۔ پیرس کے ہاتھوں میں بندوقیں اور چند توپیں آگئی تھیں۔ لیکن بارُود اور گولیوں کی کمی شدّت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ پیرس کے شہریوں نے قلعہ باسٹل پر حملہ کر کے اس کمی کو پورا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ ایک مضبُوط اور مستحکم قلعہ تھا۔ اس کی جیل میں فرانس کے مشہور دانش وروں، ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں کو بند کیا گیا تھا جو عوامی حقوق کی بحالی اور ایک نئے سویرے کی امیُد کے گیت گاتے تھے۔ یہ قلعہ شاہی جبر و تشدد کی زندہ علامت تھا۔ باسٹل کے گورنر نے حالات کے پیشِ نظر اسلحہ، بارود



غلامی کی بیڑیوں کو توڑ دو۔ انسان آزاد پیدا ہوا ہے

اور فوجی کمک میں اضافہ کر کے پیش بندیاں شروع کر دی تھیں۔ قلعہ کے ارد گرد رہنے والے باشندے گورنر کی اس تیاری سے چوکنا ہو گئے۔ انہیں اس بات کا علم ہو گیا کہ یہ تیاری کس کے خلاف کی جا رہی ہے۔ وہ قلعہ کے باہر جمع ہو گئے۔ چند جوشیلے نوجوانوں نے آگے بڑھ کر کہا۔

"ہم باسٹیل فتح کر کے دم لیں گے۔"

پیرس کے عوام کے عزم و حوصلے کے سامنے باسٹل کا مضبوط قلعہ سرنگوں ہو گیا۔ گورنر کو ہلاک کر دیا گیا اور پیرس کی سڑکوں پر اس کے سر کی نمائش کی گئی۔ باسٹل کے فاتحین میں ۹۵۴ افراد شامل تھے۔ جن میں زیادہ تر دست کار، دوکاندار، قفل ساز، قلعی گر، کارپینٹر اور کیبنٹ میکرز تھے۔

انقلاب فرانس میں جہاں محنت کش طبقے نے ہراول دستے کا کام کیا۔ وہاں دانش وروں نے اپنا تاریخی کردار ادا کر کے انقلاب کو یقینی بنا دیا۔ ان دانش وروں میں والٹیئر اور روسو کا نام سرفہرست ہے۔ شاہی خاندان نے ان کی زبان بند کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر یہ عظیم مفکر اور دانش ور ہر خوف سے بے نیاز عوامی حقوق کی بحالی، آزادی اور مساوات کے گیت گنگناتے رہے۔ انہیں خریدنے کے لئے طرح طرح کے لالچ دیئے گئے۔ مگر شاہی خاندان انہیں خریدنے میں ناکام رہا۔ ان مفکروں اور دانش وروں نے اسی سبب تاریخ میں اپنا علیحدہ مقام بنایا اور حق گوئی کی ایک ایسی مشعل فروزاں کی کہ آنے والی نسلیں رہنمائی حاصل کرتی رہیں گی۔

آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ پیرس کے عوام آخر کار اپنا یہ پیدائشی اور فطری حق حاصل کر کے رہے اور لوئیس کو تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔

'کتابیں ہی قوموں پر حکومت کرتی ہیں' والٹیئر



والٹیئر ۱۶۹۴ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ اس کا ایک بڑا بھائی بھی تھا جسے آزاد خیالی کے جرم میں کلیسا کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ بعض دوستوں نے والٹیئر کو مشورہ دیا کہ وہ توبہ کر کے اپنی جان بچالے۔ یہ سن کر والٹیئر غضب ناک ہو گیا۔ اُس نے کہا۔ "دوستو شکریہ۔ اگر تم خود پھانسی پر لٹکنا پسند نہیں کرتے تو ان لوگوں کی راہ کیوں روکتے ہو جو پھانسی پانا پسند کرتے ہیں۔"

والٹیئر کا باپ اپنے دونوں لڑکوں کی شکایت کرتا تھا۔ خدا نے مجھے دو پاگل بیٹے دیئے ہیں۔ ایک کو نثر کا جنون ہے۔ دوسرے کو نظم کا۔ یہ حالت دیکھ کر اس نے یقین کر لیا کہ والٹیئر بالکل ناکارہ نکلے گا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ اس کا یہی ناکارہ لڑکا یورپ کا سب سے بڑا اہلِ قلم تسلیم کیا جائے گا۔

والٹیئر کی ماں کے انتقال کے بعد اس کا خاندان پیرس چھوڑ کر دیہات میں جا بسا۔ یہاں ایک دولت مند خاتون نے والٹیئر کو دیکھا اور اس میں آثارِ ذہانت پایا چنانچہ مرنے سے پہلے وہ ایک نیک کام کر گئی۔ دو ہزار فرانک والٹیئر کو ہبہ کر دیئے تاکہ اس روپے سے اسے کتابیں خرید دی جائیں۔ والٹیئر کو ان کتابوں سے بڑا نفع ہوا۔ وہ عمر بھر اس آبرو باختہ عورت کا احسان مند رہا اور اس کے بعد ایک راہب کو اس سے محبت ہو گئی، لیکن وہ راہب دراصل ملحد تھا۔ اُس نے والٹیئر کو شک و الحاد کی تلقین کی اور کلیسا کی طرف سے دل میں نفرت دل نشین کرا دی۔ والٹیئر کی زندگی اور فلسفے پر اس راہب کی تعلیمات کا بڑا گہرا اثر رہا۔ اور وہ اپنی زندگی میں ایک خالص حقیقت پسند انسان بن گیا۔ خارجی عوامل سے بحث کرتا اور اس کے مطابق اپنی رائے قائم کرتا۔ مسیحی کلیسا کے خلاف اُس نے زندگی بھر اپنے قلم سے جہاد کیا۔ اُس نے کہا۔

"کتابیں ہی قوموں پر حکومت کرتی ہیں۔ دماغی تربیت سے بڑھ کر کوئی ذریعہ آزادی کا نہیں۔ جب قوم سوچنے لگ جائے تو پھر اُسے منزلِ مقصود سے روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔"



وادئ کاغان جاگیردارانہ نظام میں جکڑی ہوئی ہے

ڈاکٹر انیس عالم

ریاست ہنزہ گلگت ایجنسی میں پاکستان کے انتہائی شمالی حصے میں دریائے ہنزہ مغربی کنارے پر پھیلی ہوئی ریاست ہے۔ اس کے مختلف دیہات کی کل آبادی تیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ ہم نے ریاست ہنزہ کے لوگوں کی محنت اور ان کی تسخیر قدرت کی بڑی داستانیں سن رکھی تھیں۔ اس لئے اس دفعہ چھٹیوں میں ریاست ہنزہ کے سفر کی ٹھانی۔

پی۔ آئی۔ اے راولپنڈی سے روزانہ ایک ہوائی جہاز گلگت کے لئے چلاتی ہے چنانچہ ہم نے جولائی کے شروع ہی میں دس جولائی کے لئے چار سیٹیں مانگیں۔ کچھ دن لاہور میں انتظار کے بعد ہم خود راولپنڈی جا پہنچے۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ اگست کی پہلی تاریخ تک تو سیٹیں ملنے کی امید نہیں، اس لئے گلگت پہنچنے کے لئے ہم نے وادئ کاغان کا پرانا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاہراہِ ریشم کے کھلنے سے پہلے گلگت ایجنسی کو جانے کے لئے صرف یہی ایک راستہ تھا۔ بالاکوٹ سے وادی کاغان شروع ہوتی ہے۔ تقریباً سو میل کے بعد بابوسر درہ جو ساڑھے تیرہ ہزار فٹ بلند ہے عبور کر کے جیپ کے قابل سڑک چلاس پہنچتی ہے جو بابوسر درہ سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ چلاس سے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ سڑک گلگت تک جاتی ہے۔ ہم بالاکوٹ چودہ جولائی کو پہنچے۔ رات بالاکوٹ میں قیام کیا۔ اگلے دن گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سروس کی جیپ سے وادی کاغان میں سفر پر نکلے۔ پتہ چلا کہ سڑک صرف ناران تک کھلی ہے جو بالاکوٹ اور بابوسر درہ کے تقریباً درمیان میں واقع ہے۔ ہم نے ناران تک جیپ کا سفر کیا۔ دوپہر کو ناران پہنچے۔ ہماری جیپ کا ڈرائیور تنگی (سرحد) کا رہنے والا تھا اس نے اپنے علاقے کے کسانوں کی خانوں کے خلاف ولولہ انگیز جدوجہد کی بہت سی باتیں سنائیں۔ بالاکوٹ سے کچھ دور پارس میں ہم ناشتے کے لئے رکے۔ یہاں مقامی لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ان لوگوں نے باتوں باتوں میں وادی کاغان کی معیشت پر نظر ڈالی۔ پوری وادی کاغان سخت قسم کے جاگیردارانہ نظامِ معیشت میں جکڑی ہوئی ہے۔ پوری وادی میں انسانی محنت سے بناتے ہوئے کھیت جنگل قدرت کے عطا کردہ برف پوش پہاڑ اور ان کی ہری بھری ڈھلوانیں ان سب کے دعویدار یہاں کے سید خاندان کے افراد ہیں۔ سید خاندان سرکردہ فرد سید مزمل شاہ ہے۔ جو اس علاقے سے سرحد کی صوبائی اسمبلی کا ممبر بنا ہے۔ مزمل شاہ قیوم لیگ کا نمائندہ ہے۔

وادی کاغان کی اکثریت گوجروں پر مشتمل ہے۔ جو اکثر و بیشتر سیدوں کی مزارعت کرتے ہیں اور بمشکل چوتھائی بٹائی پاتے ہیں۔ گوجروں کے علاوہ وادی میں سواتی کشمیری قریشی اور دوسری کئی ذاتوں کے لوگ آباد ہیں جاگیرداروں اور ان کے ایجنٹوں نے ان محنت کش گروہوں میں پھوٹ پڑوانے کے لئے ان میں ذات پات کی بنا پر گروہ بندی کو فروغ دیا ہے۔ حالانکہ تمام مزارعوں پر چاہے وہ گوجر ہوں یا قریشی یا سواتی یا کشمیری شدید قسم کا تشدد ہو رہا ہے۔ وہشت و بربریت کا دور دورہ ہے۔ نظام جاگیرداری سے باغی اپنے گھر و بار سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ ان کے مال مویشی لوٹ لئے جاتے ہیں۔ وادی کاغان کی پہاڑی ڈھلوانیں پاکستان کی بہترین چراگاہیں ہیں۔ جو قدرت کی طرف سے اس

قدرت کے حسین شاہکار کا ایک دعویدار۔ سیّد خاندان

علاقے کے لوگوں کا بہترین تحفہ ہیں۔ لیکن ان پر بھی سید خاندان نے اپنی ملکیت جتائی ہوئی ہے اور وہ نیچے سے آنے والے ہر مال مویشی پر چراگاہ ٹیکس عائد کرتے ہیں۔

بالاکوٹ سے اوپر مہانڈری کے مقام پر ایک چیک پوسٹ ہے جہاں سے اوپر جانے والے مال مویشی پر ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ جو لاکھوں روپیہ بنتا ہے۔ سفر میں ایک بات جو بار بار سامنے آتی تھی وہ قدرت کی طرف سے فراوانی اور اس کے مقابلے میں یہاں کے عوام کی خستہ حالی تھی۔ قدرت کی طرف سے پانی کی بہتات اور زرخیز زمین کے ہوتے ہوئے یہاں کے عوام غریب لاچار اور مسکین ہیں۔ وجہ یہاں کا رجعت پسند جاگیرداری نظامِ معیشت ہے۔ جس کی بنا پر یہاں کے عوام کی پیداواری صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئی ہیں۔ اور وہ ہر قسم کی دولت کے باوجود ہر قسم کی سہولتوں سے عاری ہیں۔

ناران کے راستے میں جرید کے مقام پر حکومت نے ایک ورکشاپ کھولا ہوا ہے۔ یہاں مقامی لوگوں کو اون اور لکڑی کی اشیاء بنانے کی تربیت دی جاتی ہے اس قسم کے منصوبے یہاں کے لوگوں کو موسم سرما اور ان کے فارغ اوقات میں کافی کام فراہم کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ چونکہ یہاں کا جاگیردار جس کی نوکر شاہی کے ساتھ گٹھ جوڑ ہے، اس قسم کے کسی بھی منصوبے کو جس سے مقامی آبادی کو معاشی آزادی ملے، پھلنے پھولنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسلئے وہ ان منصوبے کو یہاں نہیں چلنے دیتا۔

اس طرح ہم بالاکوٹ سے قدرت کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتے اور طبقاتی سماج میں عوام کے استحصال کا جیتا جاگتا نظارہ کرتے ہوئے ناران پہنچے۔ ناران میں قیام کے لئے یا تو بہت مہنگی جگہیں ہیں، یا بہت سستی۔ یہ بھی محکمہ سیاحت کا کارکردگی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ہم نے بھی ایک سستی سی جگہ تلاش کی اور پھر کھانے پینے کی فکر میں لگ گئے۔

رات ناران میں گزار کر اگلے دن ہم جھیل سیف الملوک کو روانہ ہوئے۔ جھیل سیف الملوک ناران سے کچھ فاصلے پر تقریباً ساڑھے دس ہزار فٹ کی اونچائی پر واقع ہے۔ کافی مشکل چڑھائی ہے۔ راستے میں گلیشیر کے اوپر سے گزرنا پڑتا ہے۔ جیپ روڈ ہے لیکن ہم نے پیدل ہی جانا مناسب سمجھا۔ صبح نو بجے نکلے، بارہ بجے کے لگ بھگ جھیل پر پہنچے۔ بڑا دلکش نظارہ تھا۔ سامنے ملکہ پربت کی سترہ ہزار فٹ چوٹی تھی۔ ملکہ پربت کا گلیشیر اس جھیل کا بڑا ماخذ ہے۔ اس بلندی پر بھی جہاں جہاں گھاس تھی مال مویشی چر رہے تھے۔ گوجروں نے پتھروں کو ایکدوسرے کے اوپر رکھ کر اپنے گرمائی گھر بنائے ہوئے تھے۔ ایک دو گھر تو چاروں طرف گلیشیر سے گھرے ہوئے تھے۔ ہمارا ملک دلچسپ ملک ہے۔ یہاں انسان کے قدیم ترین پیشے گلہ بانی سے لے کر جدید ترین پیشے یہ صنعت و حرفت تک میں مصروف انسان نظر آتے ہیں۔ گلہ بان سردیوں کے موسم میں گھاس کی تلاش میں چودہ چودہ ہزار فٹ کی بلندیوں تک پہنچتے ہیں۔ پھر برف کی آمد پر اپنے مال مویشی لے کر اترائیوں کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اس دو تین ماہ

انسان نے انسان کو

ہاتھ پھیلانے پر

مجبور کر دیا

کے عرصے میں ان کا نیچے کی دنیا سے بہت کم تعلق ہوتا ہے ان کی بیماری میں ان کو کوئی طبی سہولت حکومت فراہم نہیں کرتی بس لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جاتے ہیں کچھ ہر سال مر بھی جاتے ہیں۔ تب ایسا لگتا ہے جیسے پتھر کے زمانے میں انسان آگیا ہو۔ جہاں اس کی زندگی کا مقصد ہی بس سوائے زندہ رہنے کے کچھ نہ ہو۔ کیا آرٹ کیا کلچر یہ سب ان گوجروں کے لئے ایسی عیاشیاں ہیں جن کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے بس ایک جنگ ہے فطرت کیخلاف بھوک کیخلاف۔

جھیل سیف الملوک کا محیط تین میل کا ہے۔ ہم نے ایک چکر اس کے اطراف بھی لگایا جس کے لئے ہمیں بہت سے گلیشیروں سے بھی گزرنا پڑا۔ جھیل میں کشتی رانی بھی ہم نے کی۔ شام کو ہم واپس ناران لوٹ آئے۔ آج کے سفر میں دن بھر ہمیں بچے بوڑھے بخشش مانگتے نظر آئے۔ اور مجھے ان محنت کشوں پر نہیں بلکہ اس نظام پر غصہ آیا جس نے ان کی پیداواری قوتوں کو مفلوج کر کے ان کے ہاتھوں کو اپنے ہی جیسے انسانوں کے سامنے پھیلانے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھے اس دن کا خیال آیا جب یہاں کے عوام پاکستان کے عوام کے ساتھ مل کر اپنی پشت پر سے سامراج، جاگیرداریت اور گماشتہ سرمایہ داریت کے پشت شکن پہاڑ اتار پھینکنے کی جدوجہد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پھر وہ کمر سیدھی کر کے کھڑے ہو سکیں گے تو اس وادی کے پہاڑوں کی فلک بوس چوٹیاں ان کے سامنے حقیر نظر آئیں گی۔ پھر وہ قدرت کو اپنی ضرورت یات کے مطابق ڈھالیں گے۔ آج وہ قدرت سے مغلوب نظر آتے ہیں۔ کل کو وہ اپنی جدوجہد اور پیداواری صلاحیتوں کا رخ قدرت کو تبدیل کرنے کی طرف موڑیں گے۔ پھر وہ دوسروں کے سامنے بخشش کے لئے ہاتھ اٹھانے کے بجائے دوسرے مجبور انسانوں کا ہاتھ پکڑ کر انھیں انسانیت کی بلندیوں پر لے جائیں گے۔ لیکن یہ تو مستقبل کی باتیں ہیں۔ اس وقت تو ان کے لئے صرف جدوجہد ہی جدوجہد ہے۔ مستقل جدوجہد، فطرت کے خلاف، جاگیرداروں کیخلاف سرمایہ داروں اور سامراج کے خلاف

جھیل سے لوٹ کر رات ناران میں گزاری۔ اگلے دن صبح ہی بٹاکنڈی کے لئے روانہ ہوئے۔ دریا کہنسار یہاں سے ذرا کشادہ ہو جاتا ہے۔ اس کے پانی میں ذرا ٹھہراؤ آجاتا ہے یہ جگہ بڑی پُرسکون اور خوبصورت لگتی ہے۔ ناران سے ایک کتا ہمارے ساتھ ساتھ ہو گیا تھا۔ ہم نے سوچا چلو سفر کا ایک ساتھی اور ملا۔ اب زراعت کم ہوتی جارہی تھی اور جہاں کاشت تھی وہاں بھی آلوؤں کی۔ راستے میں بہت سے مقامی لوگ ہمیں ملے۔ اور ہر ایک کی صرف ایک ہی فرمائش تھی — دوائیں۔ عام شکایت سر درد اور پیٹ کی گڑبڑ کی تھی۔ ہم جو کچھ دوائیں لے کر گئے تھے تقسیم کرتے رہے۔ دوپہر کے بعد بٹاکنڈی پہنچے۔ یہاں ہم یوتھ ہوسٹل میں ٹھہرے جو لالہ زار کے عین نیچے بڑے خوبصورت مقام پر واقع ہے۔ بٹاکنڈی یوتھ ہوسٹل میں ہم نے دو راتیں گزاریں۔ پہلی رات گزارنے کے بعد ہم دوسرے دن لالہ زار گئے۔ لالہ زار بٹاکنڈی سے ڈیڑھ ہزار فٹ اوپر واقع ایک میدان ہے۔ اور مارچ دسمبر میں پھولوں سے بھرا ہوتا ہے۔ وسط جولائی میں تو سوائے خوبصورت ہریالے میدانوں اور درختوں کے کوئی پھول نظر نہ آئے۔ لیکن لوگوں نے بتایا کہ ستمبر کے مہینے میں یہ پورا علاقہ

مویشی پالنے پر ٹیکس وصول کیا جاتا ہے



پھولوں سے لالہ زار بنا ہوتا ہے۔ دوپہر کو واپس بٹاکنڈی آ گئے۔

بٹاکنڈی میں اب روائتی فصلوں یعنی مکئی کی جگہ چند سالوں سے آلو کاشت کیا جانے لگا ہے۔ یہ یہاں کے زمینداروں کے لئے بے حد منافع بخش ثابت ہوا ہے لیکن پٹہ داری نظام کی وجہ سے کھیتوں میں ان محنت کرنے والوں کو ان کی محنت کا پورا پھل نہیں ملتا۔ ایک مثال ہم کو دی گئی کہ ایک شخص کو سید نے ایک زمین کا قطعہ ساٹھ روپے پٹہ پر دیا۔ اس شخص نے ایک چوتھائی پہ وہ زمین ایک دوسرے شخص کو دے دی۔ اب اس شخص نے سارے سال محنت کی اور دو ہزار کی مالیت کا آلو پیدا کیا۔ لیکن پٹہ دار آ کر پندرہ سو کا آلو اٹھا لے گیا۔ اس میں سے بیج اور کھاد کی قیمت نکال کر پٹہ داری دینے کے باوجود وہ اصل محنت کش سے کئی گنا رقم وصول کر گیا۔ یہ ایک عام مثال ہے۔

جاگیرداروں نے اپنے اور کاشت کاروں کے درمیان پٹہ داروں کا ایک فضول طبقہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اکثر یہ پٹہ دار سواتی اور قریش وغیرہ ہوتے ہیں۔ اور اسطرح مظلوم طبقوں کے اندر بھی ایک طبقے کو مراعات دیکر انہیں باقی محنت کشوں سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جن لوگوں سے بھی بات ہوئی ان میں اس نظام معیشت کو تبدیل کرنے کی شدید خواہش ہے۔

اگلے دن ہم بٹاکنڈی سے بوڑ دوائی کے لئے روانہ ہوئے آج بھی ہمارا سامان بھاری پیٹیوں پر تھا۔ بٹاکنڈی سے آگے سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ اور جیپ کے لئے ناقابل استعمال ہے۔ بٹاکنڈی سے آگے باربرداری کا کام انسانوں سے اور جانوروں سے لیا جاتا ہے۔ بٹاکنڈی سے تھوڑی دور نکل کر زراعت تقریباً مفقود ہو جاتی ہے۔ اور زیادہ تر لوگ گلہ بانی میں مشغول نظر آتے ہیں۔ جنگلات کی بڑی تعداد بھی غیر سائنسی طریق کٹائی اور ٹھیکیداروں و محکمہ جنگلات کے افسران کی ملی بھگت سے تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ راستے میں کئی بہت بڑے نالے ہم نے پار کئے جن پر پل لوگوں نے اپنی آمدورفت کے لئے ڈالے ہوئے تھے۔ بوڑدوائی ہم لوگ ڈیڑھ دو بجے پہنچے۔ بوڑدوائی سے ایک راستہ سولہ ہزار فٹ رتی گلی سے گزر کر آزاد کشمیر کی وادی نیلم میں جا نکلتا ہے۔ ہم سے کچھ گھنٹے قبل تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی ایک ٹیم اسی راستے سے بوڑدوائی پہنچی تھی۔ وہ اب واپس ناران جا رہے تھے۔

بوڑدوائی کے پی۔ ڈبلیو۔ ڈی ریسٹ ہاؤس میں رات گزاری۔ بوڑدوائی میں آبادی نظر نہیں آتی۔ ادھر ادھر کافی آبادی پر گلہ بان اپنے مال مویشی چراتے نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کی اور اس راہ سے گزرنے والے مسافروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایک ہوٹل اور ایک دو دکانیں ہیں جس زمانے میں گلگت جانے کے لئے وادی کاغان ہی واحد راستہ تھا تو یہ جگہ بھی خاصی بارونق تھی۔ لیکن گذشتہ دو تین سال سے اب سوائے مقامی لوگوں کے اور اکا دکا سیاحوں کے اس علاقے میں کم ہی لوگ آتے ہیں۔ چنانچہ تجارتی سرگرمیاں تقریباً ختم ہو کر رہ گئی ہیں۔ وادی کاغان کے سفر میں ایک بات جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ راستے میں مختلف مقامات پر جو دکانیں اور ہوسٹل وغیرہ تھے ان کی اکثریت بالاکوٹ سے آئے ہوئے لوگوں کے قبضے میں تھی۔ اس طرح اس علاقے کے لوگوں کو بھی جو تھوڑی بہت آمدنی اس قسم کے ذرائع سے ہو سکتی ہے وہ بھی ان کے قابو میں نہیں۔

اگلے دن صبح ہم بوڑدوائی سے اپنے اگلے پڑاؤ بیسل کی طرف روانہ ہوئے۔ موسم بڑا خوشگوار تھا اور راستہ بڑا خوبصورت۔ لیکن آبادی بہت کم۔ راستہ میں زیادہ تر گلہ بان ہی ملے۔ ایک نئی چیز جو دیکھنے میں آئی وہ کاغان سے باہر کے گلہ بان تھے۔ بوڑدوائی کے بعد سارا علاقہ چراگاہوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور زیادہ تر باہر سے آنے والے لوگ اپنے مال مویشی موسم گرما کے لئے یہاں لے کر آتے ہیں۔ اکثریت ان میں بنوں کوہاٹ کے گلہ بانوں کی تھی۔ جو اپنے ساتھ بھیڑ بکریاں، گدھے اور خچر اور اونٹ کے ریوڑ لیکر یہاں آئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو بھی ہر ایک مویشی پر ایک خاص ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ جس سے وادی کاغان کے جاگیردار سید خاندان کو لاکھوں کی آمدنی ہوتی ہے بیسل سے چار میل پرے ہی راستہ جو کہ دریا کے ساتھ ساتھ گزرتا ہے۔ طغیانی کی وجہ سے ٹوٹ گیا ہے۔ اس لئے ہمیں ایک دم کافی اونچائی پہ جا کر اس راستہ کا متبادل اختیار کرنا پڑا۔ اس چڑھائی سے پہلے ایک جگہ آتی ہے، جہاں ابرق نکلتا ہے۔ چڑھائی خاصی دشوار تھی۔ ہم چار بجے کے قریب بیسل کے پاس پہنچے۔ ہر طرف سے پُرشور نالے آ کر دریائے کنہار میں شامل ہو رہے تھے۔ بعض جگہ گلیشیر دریا تک آئے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ ہمیں بھیڑ بکریاں چرتی نظر آئیں۔ لیکن آدمی کوئی نظر نہ آیا۔ بیسل سے آدھ میل پرے ایک نالہ ہمارے راستے میں حائل ہوا۔ اسے پار کرتے کرتے گھنٹہ لگ گیا۔ آگے گئے تو بڑے بڑے پتھروں کے درمیان گلہ بانوں کے پڑاؤ نظر آئے۔ پہلی نظر میں ان کو باقی پتھروں میں سے پہچاننا دشوار ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انسان کے قدیم ترین پیشے سے تعلق رکھنے والے فطرت کو تبدیل کرنے کے بجائے اسی کی رنگ میں ڈھل جانا پسند کرتے ہیں۔ کچھ اور آگے بڑھے تو بیسل کا پڑاؤ نظر آیا۔ یہاں پہلی دفعہ کافی لوگ نظر آئے۔ چار پانچ ہوٹل بھی تھے جو گرمیوں میں اپنے مویشی لے کر یہاں آجاتے ہیں۔ بیسل سے کچھ میل آگے کوہستانی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ کوہستان کے مستقل مکین بھی گلہ بان ہیں۔ ان میں اور باہر سے آئے ہوئے ان پٹھان گلہ بانوں میں چراگاہوں پر اکثر خون خرابہ ہوتا رہتا ہے۔ چونکہ اس سارے علاقے میں حکومت کوئی دخل نہیں دیتی ہے۔ اس لئے ہر جھگڑے کا فیصلہ آپس میں لڑ جھگڑ کر ہی ہوتا ہے۔ پچھلے سال اس قسم کے ایک جھگڑے میں کچھ لوگ مارے گئے تھے۔ پتہ چلا کہ اس سال دونوں طرف سے کسی ممکنہ تصادم کے پیش نظر پٹھان کافی تیار ہو کر آئے ہیں۔

سورج کے ڈھلنے کے ساتھ ہی اونچائیوں سے مویشی نیچے آنے لگے۔ بڑا خوبصورت منظر تھا۔ سینکڑوں ہزاروں بھیڑ بکریوں اور گایوں پر مشتمل گلے ہر طرف سے نیچے آ رہے تھے۔ پتہ چلا کہ ان میں سے ہر ایک مویشی کے پیروں میں رسی باندھی جاتی ہے۔

شام ہی کو ہمارے پڑاؤ سے قریب ہی پٹھانوں نے

محنت کشوں میں پھوٹ ڈالنے کیلئے انہیں ذات پات میں تقسیم کر دیا گیا

چاند ماری کا مقابلہ کیا۔ سارا علاقہ رائفلوں کی گونج سے چیخ اٹھا۔ ہم بڑے پریشان ہوئے۔ باہر نکلے تو اصل صورت حال کا پتہ چلا۔ یہاں ہمیں ایک مجاور ملا۔ اسے کسی کتے نے ہفتہ قبل کاٹ کھایا تھا۔ اس کی پنڈلی زخم سے بھری ہوئی تھی۔ علاقے میں کسی قسم کی طبی سہولت میسر نہیں۔ ہمارے ساتھی نے پانی گرم کروا کے ٹینکچر آیوڈین سے یہ ہفتہ پرانا زخم صاف کیا اور اس پر پٹی باندھی۔ اسے کچھ درد مارنے والی گولیاں دیں۔ اس آدمی کی نگاہوں میں جو جذبۂ تشکر نمودار ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ بٹیل میں رات ہم نے ایک دکان میں گزاری۔ صبح کچھ لوگ گدھے بیچنے گلگت جا رہے تھے۔ ہم نے اپنا سامان ان کے ساتھ رکھوایا اور ان کے ساتھ روانہ ہوئے۔ صبح کا نظارہ خوب تھا۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ مویشی پھر اونچائیوں کی طرف رواں دواں تھے۔ سورج کے غروب ہونے تک انہوں نے مسلسل پہاڑوں کی اونچی ڈھلوانوں پر چرتے رہنا ہے۔ یہ معمول سارے موسم گرما چلے گا۔ حتیٰ کہ برف کی آمد ہوگی اور یہ سب اپنے اپنے علاقوں کی طرف لوٹ جائیں گے۔ دریائے کنہار بٹیل سے آگے بہت تنگ وادی سے گزرتا ہے۔ راستے میں ایک اونٹ کھڑا نظر آیا۔ اوپر نظر اٹھائی تو پہاڑی کے اوپر ایک پٹھان رائفل لئے مورچہ بند بیٹھا تھا۔ کچھ اور آگے بڑھے تو دریائے کنہار کا منبع جھیل لوسر سامنے آئی۔ ہری بھری پہاڑیوں سے گھری ہوئی یہ جھیل جس کے کناروں پر بہت جگہ گلیشیر بھی پھسل کر آ گئے ہیں۔ اپنی اتھاہ گہرائیوں کے سبب بے حد پرسکون ہے۔ اس میں ایک کنکر پھینکا تو پانی میں امواج اٹھیں جو آہستہ آہستہ پھیل کر حد نظر تک جا پہنچیں پھر ان موجوں کے کناروں پر ٹکرانے سے اور ان کے انعکاس سے مزید دائرے پیدا ہوتے۔ اور چند ہی منٹوں میں جھیل کے کنارے پر ان کے آس پاس موجوں کے پھیلاؤ، ٹکراؤ اور ملاپ سے بے شمار اشکال بن گئیں۔ ابھی ہم لوگ اس حسین نظارے میں گم تھے کہ گدھے والوں میں سے ایک بھاگ کر آیا اور بولا کہ ہم مزید پتھر جھیل میں پھینک کر ان کی گہرائیوں میں خوابیدہ جنوں کو نہ بیدار کریں۔ ورنہ وہ رات کو ہماری چارپائیاں الٹ دیں گے۔ ہم نے اس کو بھی ان لوگوں کی فطرت کے ساتھ گہری ہم آہنگی کی خواہش سے تعبیر کیا اور رات کو چارپائیوں کے بجائے زمین پر سونے کا ارادہ کیا۔ اور آگے چل پڑے۔ آگے چل کر جھیل مشرق کی طرف پھیل جاتی

ہے۔ شمال کی جانب سے بابوسر کا پہاڑی سلسلہ اس کی حد بندی کرتا ہے۔ یہ سارا علاقہ جو جھیل لوسر کے شمال میں واقع پہاڑوں پر مشتمل ہے کوہستانی لوگوں کی آماجگاہ ہے جو یہاں کے مستقل باشندے ہیں۔ اس علاقے میں حکومت کے قانون کی علمبرداری نہیں بلکہ ان کا اپنا قدیم قبائلی قانون ہے۔ کوہستانیوں اور باہر سے آنے والے پٹھان چرواہوں میں اس علاقے میں چراگاہوں پر جھگڑا رہتا ہے۔ اس وجہ سے اہم ناکوں پر پٹھان مورچہ بند نظر آتے ہیں۔ لولوسر جھیل تمام ہوئی اور دریائے کنہار کیطرح ایک نالہ مشرق کی طرف سے آتا ہوا اس میں ملتا نظر آیا۔ یہ نالہ ان سارے پہاڑی نالوں کا پانی لولوسر جھیل میں لا رہا تھا۔ جو بابوسر کے پہاڑی سلسلے سے آ رہے تھے۔ چہار طرف برفپوش پہاڑ تھے۔ بہت زیادہ اونچے نہیں۔ جن کی وجہ سے چراگاہوں کی بہتات تھی۔ لولوسر جھیل سے آگے چل کر گٹی داس کا پڑاؤ آتا ہے۔ یہاں سے آگے کا علاقہ گلگت ایجنسی میں آتا ہے۔ اور باہر سے آنیوالے پٹھان چرواہوں کی حد بھی یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے زیادہ تر چرواہے چلاس اور آس پاس کے علاقوں سے آئے ہوتے تھے۔ یہ سب لوگ مسلم تھے۔ گٹی داس کے قریب ایک شکستہ پل سے گزر کر ہم نالے کے شمالی کنارے پر چلے گئے۔ یہاں سے مسلسل چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ جو بابوسر درہ پر جا کر تمام ہوتی ہے۔ چار میل کے مسلسل لیکن بتدریج چڑھائی کے بعد ہم بابوسر درہ پر پہنچ گئے۔ یہ تیرہ ہزار چھ سو فٹ اونچائی پر واقع ہے۔ یہاں سے جنوب

سیف الملوک تک پہنچنے کیلئے گلیشر سے گزرنا پڑا

مشرق کی طرف سے ایک اور راستہ آزاد کشمیر کی وادی نیلم میں جا نکلتا ہے۔ بابوسر درہ سے اوپر بھی اونچائی پر بھیڑ بکریاں چر رہی تھیں۔ اس جگہ کے متعلق مقامی لوگوں نے مختلف توہمات کو ہوا دے رکھی ہے۔ جن کی سائنسی توجیہہ آسانی سے پیش کی جا سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان اونچائیوں پر ایسی ہوائیں چلتی ہیں جن سے مسافر چکرا جاتا ہے۔ منہ اور ناک سے خون نکلنے لگتا ہے۔ بات دراصل

یہ ہے کہ جیسے جیسے بلندی کی طرف جاتا ہے فضا میں آکسیجن کی کمی ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے جس کی وجہ سے چکر، قے اور منہ و ناک سے خون نکلنے لگتا ہے۔ اگر بتدریج اونچائی میں تبدیلی ہو تو جسم اس تبدیلی کو قبول کر لیتا ہے۔ لیکن اگر یہ تبدیلی یکایک ہو تو جسم اس تبدیلی کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ جسم کے ردعمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہم چونکہ بتدریج اونچائیوں کی طرف جا رہے تھے اس لئے ہمارے جسم نے اس تبدیلی کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔ اس کے برخلاف چلاس (اونچائی چار ہزار فٹ) سے بابوسر درہ (اونچائی تیرہ ہزار چھ سو فٹ) جیپ کے ذریعے آنے والوں کو چند گھنٹوں میں نو دس ہزار فٹ کی بلندی کا فرق پڑ جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ کمزور صحت والوں کے لئے مضر بھی ہو جاتا ہے۔

بابوسر درہ سے چہار اطراف کا نظارہ ایسا ہے کہ انسان وہ ساری تکالیف بھول جاتا ہے۔ جن کو برداشت کر کے وہ اتنی اونچائی پر پہنچتا ہے۔ بابوسر درہ سے جنوب اور جنوب مغرب کی طرف سوات اور کاغان کے برفپوش پہاڑی سلسلے ہیں۔ جنوب مغرب کی طرف اور مشرق کیطرف کشمیر کے پہاڑی سلسلے ہیں۔ شمال کی طرف دور فاصلے پر ہندوکش اور قراقرم کے پہاڑی سلسلے نظر آتے ہیں۔

بابوسر درے سے بابوسر کا گاؤں آٹھ میل کے فاصلے پر پانچ چھ ہزار فٹ نیچے کی طرف واقع ہے۔ ہم مزے مزے یہ فاصلہ طے کر کے شام کو بابوسر گاؤں پہنچے۔ بابوسر درے سے شمال کی طرف نیچے جاتے ہی ایک بنیادی تبدیلی نظر آئی۔ لوگ جو بھی ملے وہ صاف ستھرے نظر آئے۔ لباس گہرے رنگوں کے بجائے اکثر سفید یا نسبتاً ہلکے رنگوں کے نظر آئے۔ جیسے جیسے ہم نیچے کی طرف اتر گئے۔ سنگلاخ چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر بنائے ہوئے کھیتوں میں لہلاتی فصلیں نظر آئیں۔ بیشتر جگہ گندم کی فصل کاشت کی گئی تھی۔ جنگلی گلاب ہر طرف لگا یا ہوا تھا۔ ہر جگہ قدرت کے ساتھ ساتھ انسانی محنت کے شاہکار نظر آ رہے تھے۔ کاغان کے مقابلے میں یہاں کے لوگ زیادہ خوشحال نظر آتے تھے۔ اس کی وجہ جاننے کے لئے ہم بڑے بے چین تھے۔

بابوسر گاؤں چلاس سب ایجنسی کا گرمائی صدر مقام

ہے۔ راجہ آف چلاس بھی گرمیوں میں یہیں رہتا ہے ہماری آمد پر راجہ نے ہمیں اپنے گھر چائے پر مدعو کیا۔ اور بڑی پُر تکلف چائے پیش کی۔ جو بیس میل کے پہاڑی سفر کے بعد بہت مزیدار معلوم ہوئی۔ راجہ صاحب کے گھر میں جو دو چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا ہم نے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزارا۔ ان کے کمرے میں دو یادگار فوٹو نظر پڑے۔ ایک میں لیو شاؤچی کے دورہ پاکستان کی ایک فوٹو ڈھاکہ کے گورنر ہاؤس میں کھینچی ہوئی ہے۔ فوٹو میں ذوالفقار علی بھٹو منعم خان، بیگم بھٹو، ایوب خان لیو شاؤچی، مادام لیو شاؤچی، مارشل شن یی اور مادام شن یی کھڑے ہیں۔ یہ شاید ۱۹۶۶ء کی فوٹو ہے کیونکہ لیو شاؤچی اور ایوب خان معزول ہوئے۔ منعم خان قتل ہوا۔ مارشل شن یی کا انتقال ہو گیا۔ اور بھٹو صدر پاکستان بن گئے ہیں۔

راجہ صاحب سے بات چیت کی دوسرے فوٹو کے متعلق جس میں بہت سے لوگ تلواریں اور خنجر لئے بیٹھے اور کھڑے تھے۔ یہ فوٹو پچھلی صدی کی ہے۔ انہوں نے بتلایا کہ یہ ان کے دادا راجہ گوہر خان اور ان کے ساتھیوں کی فوٹو ہے۔ جنھوں نے پچھلی صدی میں گلگت کے علاقہ میں انگریزوں اور ڈوگروں کی علمداری کے خلاف مسلح جدوجہد کی سربراہی کی تھی۔ راجہ گوہر خان کی زندگی میں انگریز اور ڈوگرے گلگت میں اپنا حلقۂ اثر نہ بڑھا سکے۔ ان کو کئی بار عبرتناک شکست ہوئی۔ راجہ گوہر خان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے کے عہد میں انگریزوں نے اپنی روائتی چالوں سے کام لے کر ڈوگروں اور چترال کے حکمرانوں سے مل کر اس علاقے سے حریت پسندی کی تحریک کا خاتمہ کیا۔ انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی سزا راجہ گوہر خان کے خاندان والے ابھی تک پا رہے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک راجہ صاحب اپنے آبائی علاقے وادی یاسین جو دریائے گلگت کی وادی میں شمال کی طرف واقع ہے میں نہیں جا سکتے تھے۔ اور ان کو چلاس میں لا کر رکھا گیا تھا۔

رات بابوسر کے پی۔ ڈبلیو۔ ڈی ریسٹ ہاؤس میں گزاری۔ کئی دن کے بعد بڑی آرام دہ رات گزری۔ صبح جیپ کے ذریعے چلاس روانہ ہوئے۔ چلاس تک پہنچتے پہنچتے ہم مزید کئی ہزار فٹ نیچے اتر گئے۔ اب ہم گرم علاقے کی طرف لوٹ آئے تھے۔ سنگلاخ چٹانیں تھیں۔ بابوسر نالے کے ساتھ ساتھ کاشت کاری تھی۔ لوگوں نے چٹانیں کاٹ کر اور پتھر ہٹا کر اپنے لئے کھیت بنائے تھے۔ اور اس طرح انسانی محنت نے فطرت کو اپنے موافق ڈھال کر اسے اپنے لئے سونا اگلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس سارے علاقے کی

چینیوں نے گندم کی قلت کے زمانے میں اناج فراہم کیا

خوشحالی کی وجہ یہاں کا نظام معیشت ہے۔ زیادہ تر زمین خود کاشت کی جاتی ہے۔ جاگیرداری کا وجود ہی نہیں۔ کسان خود زمین کے مالک ہیں۔ ہمیں پتہ چلا کہ اس علاقے میں بھی کسان بڑی مقدار میں کیمیائی کھاد استعمال کرتے ہیں۔ نچلے علاقوں میں دو دو فصلیں ہوتی ہیں۔ علاقہ چونکہ خشک ہے۔ اس لئے پھلوں کے لئے فضا بے حد سازگار ہے۔ اس سارے علاقے میں انگور، خوبانی اور دیگر سرد علاقے کے پھل بے تحاشا ہوتے ہیں۔ اخروٹ اور بادام ابھی کچے تھے۔ صرف خوبانی پکنے والی تھی۔ بابوسر اور کاغان وادی کا موازنہ کرنے سے ایک بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ "جاگیرداری نظام عوام کی پیداواری صلاحیتوں کو بُری طرح مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے"۔ یہی وجہ تھی کہ کاغان وادی میں پانی اور زرخیز زمین کے باوجود زراعت اتنی ترقی یافتہ نہ تھی جتنی بابوسر کے علاقے میں۔ پھر کاغان وادی کے لوگ غریب اور مسکین، اور بابوسر کے علاقے کے لوگ نسبتاً خوشحال ہیں۔ معاشی آزادی نے انہیں ایک ایسی خودداری اور عزت نفس فراہم کی ہے جس سے کاغان کے مزارع اور کھیت مزدور محروم ہیں۔ بس یہ پتہ چلا کہ "جاگیرداری نظام کی بیخ کنی سے عوام الناس کی خوابیدہ پیداواری صلاحیتوں کو بے پناہ فروغ ملتا ہے"۔

دس بجے کے قریب ہم چلاس پہنچے۔ چلاس دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔ یہاں سے بھی ایک نالہ پہاڑوں سے آ کر دریائے سندھ میں ملتا ہے۔ نالے کے ساتھ ساتھ لوگوں نے کاشت کی ہے۔ چلاس بے حد گرم علاقہ ہے۔ ہم نے یہاں چند گھنٹے قیام کیا۔ پھر پیچھے سے آنے والے ٹرک میں بیٹھ کر ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ ہم گلگت کی طرف روانہ ہوئے۔ اب ہم شاہراہ ریشم کے اوپر سفر کر رہے تھے۔ سڑک کافی چوڑی ہے۔ اور ٹرک با آسانی سفر کر سکتے ہیں۔ ابھی بھی بہت سے حصوں میں کام رہتا ہے۔ اس لئے ہفتے میں تین دن کے لئے سڑک پر سے ٹریفک کی آمدورفت روک دی جاتی ہے تاکہ کام جاری رہے۔ مکمل ہونے پر یہ سڑک سوات میں بشام کے مقام سے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ گلگت اور پھر درہ خنجراب تک ہر موسم میں کارآمد پکی سڑک ہو جائے گی۔ اور اس سے گلگت کے علاقے کے لوگوں کو بہت سی سہولتیں میسر آئیں گی۔ ابھی سے اس سڑک نے اس علاقے کے لوگوں کو باقی پاکستان کے ساتھ ہر موسم میں آمدورفت کی سہولت فراہم کی ہے۔ ان کی زندگیوں میں پہلی دفعہ ورنہ صرف موسم گرما میں ہی درہ بابوسر کے راستے یہاں کے لوگ باقی پاکستان سے رابطہ رکھ سکتے تھے۔ درہ خنجراب سے ہنزہ سے پہلے تک کا سو میل کا ٹکڑا چینیوں نے پہلے ہی مکمل کر کے پاکستانیوں کے حوالے کر دیا ہے۔

• شاہراہ ریشم کا بیشتر حصہ بے آباد علاقے سے گزرتا ہے چونکہ بارش ہوتی نہیں، زمین زرخیز ہے لیکن پانی کی کمی ہے۔ اس لئے کاشت صرف پہاڑی نالوں کے آس پاس ہوتی ہے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ جہاں کہیں بھی نالے آ کر دریائے سندھ میں ملتے ہیں کاشت ہوتی ہے۔ سڑک زیادہ تر تین سے چار ہزار فٹ کی اونچائی پر واقع ہے۔ راستے میں ایک جگہ گندھک کے چشمے بھی آئے۔ چھ بجے ہم تھالیچی پہنچے۔ جہاں سے ۲۷ ہزار فٹ بلند ننگا پربت کا بے مثال نظارہ ہے۔ گو ہم چوٹی دیکھنے میں تو ناکام رہے چونکہ بادلوں کی موجودگی اسے ہماری نگاہوں سے روپوش رکھنے میں کامیاب رہی — ننگا پربت کے علاقے فراموش اور راکھا پوشی کے پہاڑی سلسلے بھی نظر آتے تھے۔ اب اندھیرا ہونے لگا تھا گلگت ہم رات کے گیارہ بجے پہنچے۔ انڈس ہوٹل میں قیام کیا۔ یہ ہوٹل ہزارہ سے آئے ہوئے کسی آدمی کے زیر انتظام ہے۔

گلگت اچھا خاصا بڑا قصبہ ہے۔ تجارت کا بڑا مرکز ہے۔ شاہراہ ریشم کھلنے سے تجارتی سرگرمیاں عروج پر ہیں۔ چین اور گلگت کی علاقائی تجارت بھی یہاں کے تاجروں کے لئے ایک بہت ہی نفع بخش کاروبار ہے۔ گذشتہ دو تین سال میں بے شمار نئی نئی دکانیں تعمیر ہوئی ہیں۔ اور بہت سی نئی تعمیر ہو رہی ہیں۔ زیادہ تر تجارت سوات، دیر سرحد، چلاس، راولپنڈی وغیرہ سے آئے ہوئے تاجروں کے ہاتھوں میں ہے۔ ہنزہ کے اسمٰعیلی بھی تیزی سے اس میدان میں آ رہے ہیں۔ اور گزشتہ دو تین سالوں میں وہ اس تجارت اور دکانوں میں سے کافی بڑے حصے کے مالک بن گئے ہیں۔ ٹرانسپورٹ گلگت سے باہر کی سرحد کے ٹرانسپورٹرز کے ہاتھوں اور گلگت ایجنسی اور بلتستان کے اندر زیادہ تر ہنزہ کے لوگوں کے قبضے میں ہے۔

گلگت میں پنجاب اور پاکستان کے دوسرے علاقوں سے آئے ہوئے بہت سے لوگ ہیں جو مختلف سرکاری محکموں مثلاً پی۔ آئی۔ اے سول ایوی ایشن، پی ڈبلیو ڈی وغیرہ میں ملازم ہیں۔ اس کے علاوہ گلگت فوج کی بہت بڑی چھاؤنی بھی ہے۔ اس لئے یہاں فوجیوں کی بڑی تعداد

میر آف ہنزہ کا منصب موروثی بن گیا

بھی قیام پذیر ہے۔ مزید پاکستانی فوج کے انجینئرز یہاں شاہراہِ ریشم کی تعمیر کے سلسلے میں بھی بڑی تعداد میں مقیم ہیں۔ کارگل سیکٹر اور کشمیر کے محاذ پر یہاں سے سپلائی ہو رہی ہے۔ اس لئے بیشتر جیپیں فوج نے حاصل کی ہوئی ہیں اندرون گلگت و بلتستان سفر بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ ہمیں ہنزہ جانے کے لئے کوئی جیپ نہیں مل رہی تھی۔ دن بھر گلگت میں گزارا۔ شام کو ایک دوست نے سرکاری جیپ میں ہمارے سفر کا انتظام کر دیا۔ شام کو ہم سفر پر روانہ ہوئے۔ موسم بڑا خوشگوار تھا اور چاندنی رات تھی۔ اس لئے سفر بڑا خوشگوار رہا۔ رات گیارہ بجے ہم ریاست نگر کے ایک گاؤں ہنی پہنچے۔ رات یہاں ہم نے ایک ٹینٹ میں گزاری۔ صبح ناشتے کے بعد باہر سیر کے لئے نکلے تو طبعیت خوش ہو گئی۔ چاروں طرف بڑی محنت سے کاشت کئے کھیت فصلوں سے لدے کھڑے تھے۔ کئی جگہ گندم کی کٹائی ہو رہی تھی۔ سفیدے کے درخت بڑی تعداد میں کھیتوں کے ارد گرد بوئے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ سیب اور خوبانی سے درخت لدے کھڑے تھے۔ اخروٹ ابھی نہیں پکے تھے۔ ایک کسان نے ہمیں ڈھیر ساری خوبانیاں توڑ کر لا دیں۔ پہلی دفعہ نگاہوں کے سامنے درخت سے توڑی ہوئی خوبانیاں کھائی تھیں بڑا لطف آیا۔ کسانوں سے بات چیت ہوئی تو پتہ چلا کہ اس علاقے میں زیادہ تر زمینیں خود کاشت ہیں۔ غیر حاضر زمیندار یا مزارع ناپید ہیں۔ ملکیتیں تھوڑی ہیں۔ لیکن انہیں انسانی محنت نے اتنا آباد اور بنا دیا ہے کہ گزر بسر ہو جاتی ہے۔ لوگ صحت مند نظر آتے ہیں۔ گاؤں میں پرائمری اسکول بھی ہے۔ معاشی آزادی نے یہاں کے لوگوں کو عزت نفس دی ہے۔ جو ان کے رہن سہن میں جھلکتی ہے۔ لوگ کام کاج کے باوجود صاف ستھرا لباس پہنتے ہیں۔ غیروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ راکھاپوشی کا ساڑھے پچیس ہزار فٹ بلند پہاڑ ہنی گاؤں کے عین اوپر واقع ہے۔ درحقیقت ہنی گاؤں کی معیشت کا دارومدار ہی اس پہاڑ سے آنے والے نالوں کے پانی پر ہے۔ گیارہ بجے ہم پھر جیپ میں بیٹھے۔ کچھ دور چل کر ہم نے دریائے ہنزہ کو عبور کیا۔ اور اس کے مغربی کنارے پر آ گئے۔ ریاست ہنزہ دریائے ہنزہ کے ساتھ ساتھ مغربی کنارے پر اور ریاست نگر مشرقی کنارے پر واقع دیہات پر مشتمل ہے۔ ریاست ہنزہ کے باشندوں کی اکثریت اسمٰعیلی عقیدے کی پیرو ہے۔ جبکہ نگر کی آبادی شیعہ عقیدہ کی ماننے والی ہے۔

یہاں کی بولی کو بروشسکی کہتے ہیں۔ جبکہ گلگت چلاس اور وغیرہ کی طرف شینا زبان بولی جاتی ہے۔ وادی یاسین کے علاقے میں چترالی بولی جاتی ہے۔ جبکہ بلتستان اور سکردو میں بلتی زبان بولی جاتی ہے۔ جیپ نے ہمیں ریاست ہنزہ کے صدر مقام کریم آباد سے گیارہ میل پرے اتار دیا۔ یہاں سے ہم پیدل آگے چلے۔ راستے میں مرتضیٰ آباد حیدر آباد علی آباد نامی گاؤں سے گزرتے ہوئے ہم چار بجے کے قریب کریم آباد کے پی ڈبلیو ڈی کے ریسٹ ہاؤس پہنچے۔ راستہ صاف ستھرے گاؤں سے گزرتا تھا۔ چاروں طرف برف پوش پہاڑ جن کے سامنے بنجر چٹیل پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر سیراب کر کے یہ گاؤں آباد کئے گئے ہیں۔ زیادہ تر سفیدے کے درخت اگائے گئے ہیں۔ گندم کی فصل تیار تھی۔ اور اکثر جگہ کاٹی جا رہی تھی۔ بہت سے کھیتوں میں گندم کی کٹائی

شاہراہِ ریشم کا

بیشتر حصہ

بے آباد علاقہ سے

گزرتا ہے

کے بعد مکئی کی بوائی ہو چکی تھی۔ ہر طرف پھل دار درخت بھی تھے۔ جن سے توڑ توڑ کر ہم خوبانیاں کھاتے اور چلتے رہے۔ بہت سے بچے ہمارے ساتھ ہو گئے تھے۔ لیکن ان کا سلوک ہمارے ساتھ بہت دوستانہ تھا۔ وہ ہم سے معلومات حاصل کرنے اور اپنے متعلق معلومات دینے کے مشتاق تھے۔ تعلیم خاصی عام معلوم ہوتی ہے۔ چونکہ ہر جگہ سکول کے بچے ملے ہر گاؤں میں صاف ستھرا عبادت خانہ بھی نظر آیا۔

رات کا کھانا ہم نے جلدی کھایا۔ لیکن دال چاول اور آلو کے سوا کچھ نہ ملا۔ یہی کچھ ہم نے اپنے اگلے تین دن کے قیام میں بھی کھایا۔ اس علاقے میں ہر وہ سبزی کاشت ہوتی ہے جس سے ہم لاہور یا کراچی میں واقف ہیں۔ لیکن یہاں سبزیوں و دیگر اشیاء خوردنی کی مارکیٹ نہیں۔ چونکہ ہر خاندان ان ضروریات کے معاملے میں کافی حد تک خود کفیل ہے۔ کریم آباد کی آبادی خالی ہے۔ لیکن یہاں کوئی بازار قابل ذکر نہیں البتہ اکا دکا دکانیں ادھر ادھر ہیں۔ جن میں آٹا، چاول، گھی، دالیں آلو، پیاز، کپڑا و دیگر ضروریات زندگی ملتی ہیں۔ ایک ہی دکان میں سوختنی لکڑی بھی ملتی ہے اور کپڑا بھی۔ ہر خاندان اپنے کھیت میں گندم کے ساتھ ساتھ سبزیاں بھی اگاتا ہے۔ اس لئے گو یہاں کے رہنے والوں کو تو سبزی و انڈوں وغیرہ کی دشواری نہیں لیکن باہر سے آنے والوں کے لئے ان چیزوں کی فراہمی کافی مشکل ہے۔

صبح اٹھے تو بڑا پر شکوہ منظر نظر آیا۔ سامنے راکھاپوشی کا پہاڑی سلسلہ تھا۔ پشت پر وہ برف پوش پہاڑ تھے جو ہنزہ کے اس حصے کے گاؤں التیت بلتیت، کریم آباد، حیدر آباد وغیرہ کو شادابی بخشتے تھے اپنے چشموں اور نالوں سے۔ ان برف پوش پہاڑوں کی ترائیوں میں جہاں کہیں بھی انسانی ہاتھ مصروف بہ عمل نہیں وہاں زمین ہریالی سے محروم ہے۔ اس علاقے کی شادابی، پھلوں کی فراوانی، سفیدے کی فضا میں بلندی یہ سب انسانی محنت کی عظمت کے گن گاتے نظر آتے ہیں۔

ناشتے کے بعد سیر کو نکلے۔ یہاں گاؤں کی آبادی ایک ساتھ نہیں رہتی ہے۔ بلکہ ہر کھیت کے ساتھ مکان ہیں۔ صاف ستھرے چھوٹے چھوٹے مکانات۔ بہت کثرت سے سفیدہ بویا گیا ہے۔ اس کی لکڑی یہاں عمارتی ضروریات کے لئے اور جلانے کے لئے کام آتی ہے۔ سفیدے کا درخت یہاں کی آب و ہوا میں بڑی تیزی سے بڑھتا ہے۔ اور ان پہاڑوں میں عجب بہار دکھلاتے ہیں۔ ہنزہ ریاست کی آبادی تیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ آبادی کے اضافے اور نئی زمینوں کی عدم موجودگی نے ہنزہ کے لوگوں کو اپنے علاقے سے باہر جا کر اپنا روزگار کمانے پر مجبور کیا ہے۔ اب ہنزہ کے لوگوں نے گلگت کے مختلف حصوں میں نئی نئی زمینیں آباد کی ہیں۔ اس کے علاوہ مردوں کی بڑی تعداد پاکستان کے مختلف شہروں میں روزگار میں لگی ہوئی ہے۔ معاشی مجبوری کی بناء مردوں کی بڑی تعداد کا اپنے گھروں سے نکلنے سے یہاں پر موسم گرما کے علاوہ جبکہ بہت سے مرد چھٹیوں میں گھر واپس لوٹتے ہیں اور مردوں کی تعداد بہت کم نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ سے کھیتی باڑی کا بیشتر کام عورتوں کے ذمے ہے۔ اس وجہ سے یہاں عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ معاشی مجبوری نے انہیں اس عیاشی کا متحمل نہیں چھوڑا۔ عام طور سے ذمہ داریوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ کھیتوں میں ہل چلانا، فصل کو پانی دینا اور گاؤں سے

کاغان میں تجارت پر کوہاٹ والوں کی اجارہ داری ہے

باہر بار برداری مردوں کے ذمے، اور بیج ڈالنا، گوڈائی کرنا، فصل کاٹنا، اسے گاہنا وغیرہ یہ سب عورتوں کی ذمہ داری ہے۔ یہاں کے مردوں کا لباس تو سرحد کے کسانوں کا سا ہے۔ یعنی شلوار اور قمیض، لیکن عورتوں کا لباس بڑا دیدہ زیب ہے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے کرتے اور بڑے گھیر کی شلوار کے اوپر ایک بڑی خوبصورت گول ٹوپی پہنتی ہیں۔ ٹوپی کے اوپر خولصورت دوپٹہ ہوتا ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کا لباس آنکھوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ٹوپیاں بڑی مشقت اور محنت سے کاڑھی جاتی ہیں۔ ایک ٹوپی پر عموماً ہفتہ لگ جاتا ہے۔ عام طور سے یہ کام سردیوں کے دنوں میں کیا جاتا ہے جب کھیتوں میں کام کم ہوتا ہے۔

ہنزہ کی آبادی کی اکثریت اسمٰعیلی ہے۔ پرنس عبدالکریم آغا خان کو اپنا روحانی پیشوا مانتی ہیں۔ مرکزی ایشیا میں اسمٰعیلیوں کی مرکزی کمیٹی کے سربراہ میر آف ہنزہ ہیں۔ وہ اس علاقے میں اسمٰعیلیوں کے مابین مسائل کا حل کرتے ہیں۔ اور یہاں کے عوام کی معاشرتی زندگی کو بھی ریگولیٹ کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ شروع میں میر آف ہنزہ یہاں کے عوام نے چنا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ موروثی عہدہ بن گیا۔ میر اپنی زمینوں پر ایک چوتھائی بٹائی لیتا ہے۔ اس کے علاوہ باقی کسان بھی اسے کچھ ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ بہرحال میر کی آمدنی بہت ہے۔ چونکہ اس کی رہائش بڑی امیرانہ اور ٹھاٹ باٹ سے ہے۔ اس نے راولپنڈی میں ایک کافی بڑی کپڑے کی مل بھی لگائی ہے جو ہنزہ ٹیکسٹائل مل کے نام سے مشہور ہے۔ عوام کے مابین جھگڑوں کی عدم موجودگی یہاں کے عوام کا بہتر معاشرتی شعور ہے جو مل جل کر زندگی گزارنے کے قائل ہیں۔ انہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں باہم مسائل کو نپٹانے کے لئے اصول وضع کئے ہوئے ہیں۔ ان اصولوں سے روگردانی معاشرہ میں سوشل

ہے۔ غربت ہے لیکن لوگوں کے درمیان زیادہ اونچ نیچ نہیں ہے۔ رہن سہن عموماً ایک سا ہے۔

اس معاشرہ میں ترقی کی بہت گنجائش ہے۔ انفرادی ملکیتی نظام کے تحت جتنی ترقی ہو سکتی تھی وہ اس معاشرہ نے کر لی ہے۔ اب اس معاشرے کو آگے بڑھنے کے لئے امداد باہمی کے تحت زرعی نظام اپنانے کی ضرورت ہے تاکہ مزید ترقی کی گنجائش نکلے۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام سے اسمٰعیلیوں کے سربراہوں کی گہری وابستگی شاید اس بات کی متحمل نہ ہو سکے۔

شاہراہ ریشم کے کھلنے سے یہاں کی معاشرتی زندگی میں ایک تناؤ سا پیدا ہوا ہے۔ جہاں رسل و رسائل کی سہولتیں ملی ہیں وہاں بیرونی دنیا سے رابطوں کے لازمی مضرات بھی یہاں کے لوگوں کو پریشان کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس کئی لوگ آئے جن سے ان مسائل پر تفصیلی گفتگو ہوئی اور کچھ اس طرح کے نتائج سامنے آئے۔

شاہراہ ریشم پاکستانی فوج کے انجینئروں کے زیر اہتمام بن رہی ہے۔ ان فوجیوں کی بڑی تعداد گلگت سے باہر کی ہے اور ان میں بھی بڑی تعداد پاکستان کے ان علاقوں سے ہے جہاں زراعت بڑی دشوار اور موسم کے اوپر منحصر ہے۔ میرا مطلب میانوالی، جہلم، راولپنڈی، کیمبل پور وغیرہ سے ہے۔ جب یہ سپاہی یہاں کے سرسبز و شاداب پھلوں سے لدے باغات دیکھتے ہیں تو ان کا دل جھوم اٹھتا ہوگا۔ یہاں کے لوگ بھی باہر کے لوگوں کی مہمان نوازی میں کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ ان کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ خود توڑ کر پھل کھائیں۔ لیکن مہمانوں سے اتنی توقع تو رکھتے ہیں کہ پھل کھائیں گے درخت نہیں کھائیں گے۔ اس علاقے کی خوشحالی میں شریک ہوں گے۔ اسے برباد نہ کریں گے۔

یہاں کے لوگ چینیوں کی مثال دیتے ہیں جنہوں نے

سے بھرپور علاقے سے گزرتی ہے۔ چینیوں نے دو سال کے قلیل عرصے میں مکمل کر دی تھی۔ اپنے قیام کے دوران چینیوں نے یہاں کے عوام پر کوئی بوجھ نہ ڈالا۔ ان کے درختوں سے کوئی پھل نہ توڑا۔ چٹانوں کو بارود سے اڑاتے وقت کھیتوں مکانوں اور درختوں کی حفاظت کی۔ اس علاقے کے لوگوں کی ان کے مسائل میں بھرپور مدد کی۔ گندم کی قلت کے زمانے میں ان کے لئے اناج فراہم کیا وغیرہ وغیرہ۔

ان کا تعمیری طریقہ بھی بڑا سائنٹفک تھا۔ ان کا سب سے اگلا جتھہ پہلے پیدل چلنے کیلئے راستہ بناتا تھا۔ دوسرا جتھہ اس راستے کو چوڑا کر کے اسے جیپ کے قابل بناتا تھا۔ پھر تیسرا جتھہ اس کو مزید چوڑا کر کے ٹرکوں کے قابل بناتا تھا۔ آخری جتھہ اسے پختہ کر دیتا ہے۔ پہلے اور آخری جتھے کے درمیان کبھی بھی پندرہ میل سے زیادہ کا فاصلہ نہ ہوتا تھا۔ اپنی روانگی پر چینیوں نے اپنا سارا تعمیراتی سامان بمعہ بھاری روڈ رولر الیکٹرک جنریٹرز بل ڈوزر وغیرہ وغیرہ پاکستانی انجینئروں کے حوالے کر دیا تھا۔ اب اسی سامان کو پاکستانی استعمال کر رہے ہیں۔

بقیہ : مزدور

بڑے اطمینان سے سیڑھیوں پر چڑھے اور ایک کمپونڈر سے دریافت کیا آدمی کہاں ہے۔ کمپونڈر انہیں ایک کمرہ کی طرف لے گیا۔ وہ اندر داخل ہوئے اور چارپائی پر ایک مزدور کو پڑا دیکھ کر حقارت سے ادھر اُدھر دیکھا اور بولے:

”کیا یہی آدمی تھا جس کے لیے مجھے اتنی تکلیف دی؟ تم خود نہیں دیکھ سکتے تھے ــــ ؟ کیوں جی ــ ؟“

”جی حضور! لیکن ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے ابھی تک زندہ ہے ــ ــــ !“

چونکہ میجر صاحب آ ہی گئے تھے اس لیے انہوں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا ـــــــ ”کیا اس کو زندہ کہتے ہیں آپ ؟ اس میں دھرا کیا ہے ـــــ مر گیا ہے ــــ !“

انہوں نے زور سے اس کا ہاتھ چارپائی پر پٹخ دیا۔ اور باہر چلے گئے ـــــــ لوگوں کے منہ سے اطمینان اور یکسوئی کی آہ نکلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور چارپائی پر آدمی ہلکے سے ہلا، اسے ایک سسکی آئی ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ مر گیا۔

ہنزہ میں کھیتی باڑی کا کام عورتیں کرتی ہیں

بائیکاٹ کا باعث بن جاتی ہے۔ اس طرح یہ عوام کا اپنا دباؤ ان میں سے ہر ایک کو معاشرے کے وضع کردہ اصولوں کو اندر رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس طرح یہ معاشرہ جس میں زیادہ تر لوگ خود زمینوں کے مالک ہیں پُرسکون نظر آتا

اپنی سرحد سے سو میل تک پختہ سڑک پاکستان کے اندر تعمیر کی ہے۔ یہ سڑک ہر موسم میں کھلی رہتی ہے۔ اور اس کی تعمیر میں چٹانوں کے پھسلن کو روکنے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ سڑک جو پاکستان کے شمالی علاقے سے گلیشیوں

ساقی جاوید

غزل

اپنے لہو کو صرفِ قلم کر رہے ہیں ہم
اِک عہدِ غم ہے جس کو رقم کر رہے ہیں ہم

ایک اِک گلی میں عظمتِ انساں کے نام پر!
تعمیر روشنی کے حرم کر رہے ہیں ہم

پلتی رہی ہیں حق و صداقت کا جو لہو
سر اُن روایتوں کے قلم کر رہے ہیں ہم

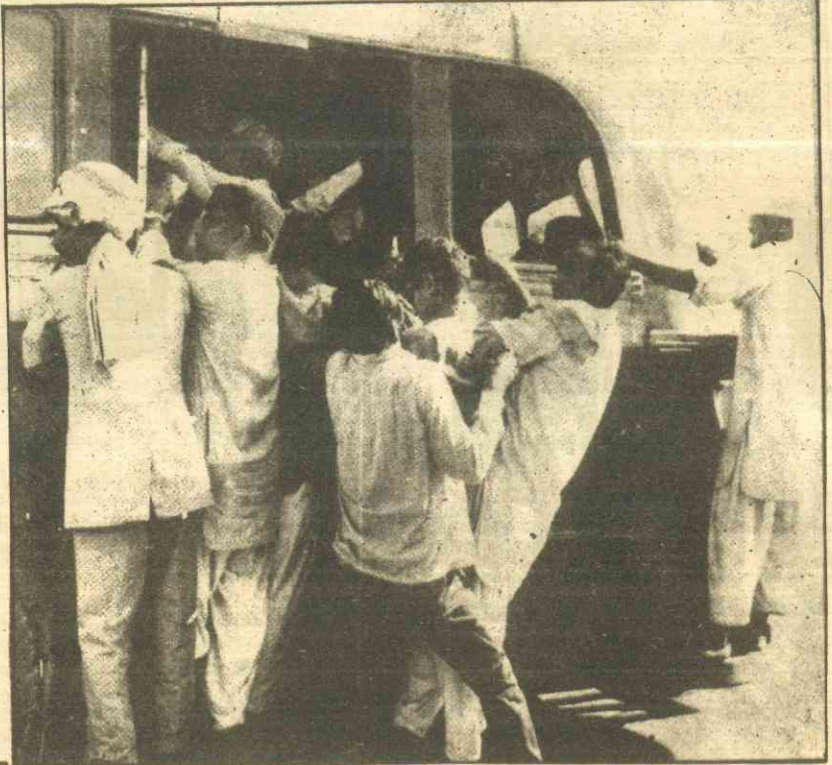
صدیوں سے جو ہے اپنے در و بام کا نصیب
اُس تیرگیٔ شہر کو کم کر رہے ہیں ہم

پھر آگیا ہے لب پہ کسی "مہرباں" کا نام
پھر انتظارِ "دستِ کرم" کر رہے ہیں ہم

سَر کیلئے خرید نئے آئے جن سے زخم
اُن کیلئے چراغ بہم کر رہے ہیں ہم!

اب بھی کھلے نہ پھول تو دستِ ہنر پہ خاک
صحنِ چمن کو خون سے نم کر رہے ہیں ہم

کراچی کی بسوں میں ہر ہفتے اکیس جھگڑے ہوتے ہیں



بسیں ــــــ سیاست کا اکھاڑہ بنتی جارہی ہیں

نعیم آروی

کراچی کی بسوں میں آئے دن ہونے والے جھگڑوں کا موسم سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ سردی کے ایام میں جھگڑے اور مار پیٹ کی شرح میں حیرت انگیز کمی آجاتی ہے۔ جب کہ گرمی کے دنوں میں جھگڑے بڑھ جاتے ہیں۔ رمضان کے دنوں میں بھی مسافر زیادہ لڑتے جھگڑتے ہیں۔ کنڈکٹروں کا پارہ بھی خاصا اونچا رہتا ہے۔ سردیوں میں کبھی کبھار ہونے والے جھگڑے معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ بات تو تو میں میں اور گالی گلوچ پر ختم ہو جاتی ہے۔ گرمی کے دنوں میں فساد کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔ عام طور پر نوبت مار پیٹ اور سر پھٹول تک جا پہنچتی ہے۔ ہر چار واقعات میں سے دو کی پولیس تھانے میں رپورٹ درج کرائی جاتی ہے۔

اس سلسلے میں جب سروے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ایک بس ۲۴ گھنٹوں میں چھ ٹرپ لگاتی ہے۔ کم از کم تین ٹرپ کے دوران بس کے اندر مسافروں میں جھگڑا ہوتا ہے۔ جھگڑوں کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ رش کے اوقات میں ایک دو بار مسافروں اور کنڈکٹروں کے درمیان بھی تلخ کلامی یا جھگڑا ہوتا ہے۔ اس قسم کے جھگڑے زیادہ سنگین نوعیت اختیار نہیں کرتے۔ کیونکہ مسافر نفسیاتی طور پر کنڈکٹروں سے ڈرتے ہیں اور کنڈکٹر لڑنے جھگڑنے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے بس میں زیادہ سے زیادہ مسافر لوڈ کرنے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس لئے وہ بات آگے بڑھانے سے عموماً احتراز کرتے ہیں۔ البتہ خالی اوقات میں ایسا موقع ضائع نہیں کرتے۔ اس طرح سروے کے مطابق ہر ہفتے بسوں کے اندر ۲۱ بار جھگڑے ہوتے ہیں اور ایک ماہ میں ۸۴ جھگڑے ہوتے ہیں۔ لیکن ان جھگڑوں میں موسم کے اعتبار سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ زیادہ گرمی پڑنے کی صورت میں جھگڑوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اگر موسم ابر آلود رہا۔ ہوائیں چلتی رہیں تو مسافروں اور کنڈکٹروں کا موڈ بھی قدرے خوش گوار رہتا ہے۔

جھگڑوں کی نوعیت

شہر کے مختلف روٹوں پر چلنے والی بسوں کے کنڈکٹروں نے بتایا: "مہنگائی کے ساتھ ساتھ مسافر بھی چڑچڑے ہوتے جا رہے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑنے جھگڑنے لگتے ہیں۔ بھیڑ میں دھکم پیل تو ہوتا ہی ہے۔ کسی کا پیر کسی دوسرے آدمی کے پیر پر چڑھ گیا۔ یا کسی کا جسم کسی دوسرے مسافر کے جسم سے ٹکرا گیا تو جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ ایک کنڈکٹر نے اس قسم کے واقعہ کو تمثیلی انداز میں بیان کیا۔

"ارے اپنے زور میں کھڑا رہو، بار بار مجھ پر چڑھا آرہا ہے۔"

"پہلوان اگر بس میں تکلیف ہوتی ہے تو ٹیکسی پر چلا کرو، یہاں تو ایسا ہی ہوگا۔"

"ابے ایسا کیسے ہوگا۔ میں تیرے دانت جھاڑ دوں گا۔"

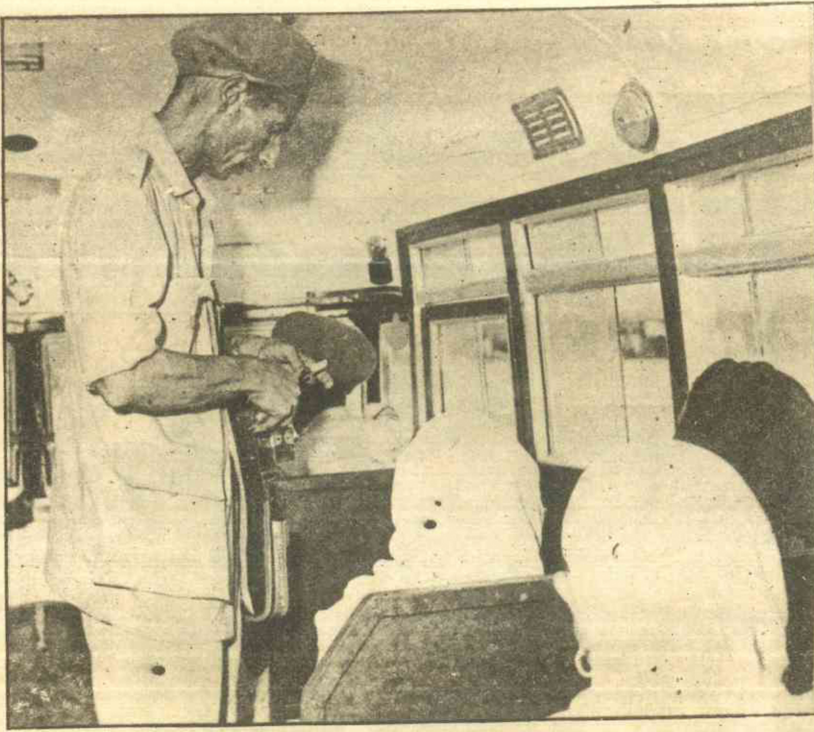
"منہ سنبھال کر بات کر نہیں تو حلیہ بگاڑ دوں گا۔ سالے کیا سمجھ رکھا ہے۔ ابے تبے سے بات کئے جا رہا ہے۔"

کنڈکٹر نے بتایا۔ دونوں میں سے کوئی ایک جسمانی طور پر کمزور ہوا تو جھگڑا ہو جاتا ہے۔ اگر دونوں مضبوط ہوئے تو بس کے اندر ہی دھینگا مشتی شروع ہو جاتی ہے۔" اور اگر دونوں کمزور ہوئے تو ۔۔۔" میں نے سوال کیا۔ تو پھر راستے بھر دونوں بک بک جھک جھک کرتے رہیں گے۔ لڑیں گے نہیں اور پھر یہ قصہ اس وقت ختم ہو گا جب دونوں میں سے کوئی ایک اپنے اسٹاپ پر پہلے اتر جائے ۔۔۔" کنڈکٹر نے میرے سوال کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

جھگڑے کی نوعیت معلوم کرنے کے لئے بے شمار کنڈکٹروں اور مسافروں سے ملاقات کی گئی جس سے اس بات کا پتہ چلا کہ بسوں کے اندر جھگڑے کیوں ہوتے ہیں اور ان کی نوعیت کس قسم کی ہوتی ہے۔

سروے کے مطابق بسوں کے اندر زیادہ تر جھگڑے سیاسی بحث و مباحثہ اور بھیڑ کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ کنڈکٹروں اور مسافروں کی اکثریت نے اس بات کی تصدیق کی کہ بس میں سیاسی بحث و مباحثہ پر پابندی عاید کر دی جائے تو جھگڑے اور مار پیٹ کے واقعات میں کمی آ جائے گی ۔۔۔" اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا ۔۔۔" لیکن یہ ایک مشکل بات ہے۔ کیونکہ روٹی اور روزگار کا تعلق سیاست سے ہے۔ آدمی کو جب تک روٹی کی ضرورت رہے گا وہ سیاست میں اپنی ٹانگ اڑاتا رہے گا۔"

ملک کی سیاسی صورت حال اور اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ سیاسی بات چیت میں بھی نرمی اور گرمی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ سیاسی حالات کی تبدیلی سے عوام بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور بسوں میں سیاسی تبدیلی کے پیش نظر سیاسی قسم کی گفتگو میں تیزی اور تندی پیدا ہو جاتی ہے۔ لمبے روٹوں کی بسوں میں سیاسی بحثیں زیادہ ہوتی ہیں۔



رمضان کے دنوں میں مسافر زیادہ جھگڑتے ہیں

ایوب خان کے شروع کے تین چار سال کے دوران بسوں میں سیاسی گفتگو بالکل ختم ہو گئی تھی۔ لوگ اس قسم کی بحث چھیڑتے یا اس میں حصہ لینے سے ہچکچاتے تھے۔ لڑائی جھگڑے بھی کم ہوتے تھے۔ ایوب خان نے مارشل لاء ختم کر کے بنیادی جمہوریت کے تحت کنٹرول جمہوری آزادی کا اعلان کیا تو بسوں میں بھی بتدریج سیاسی بحث و مباحثہ کی ابتدا ہو گئی۔ ساتھ ہی بسوں کے اندر دوبارہ سیاسی جھگڑے شروع ہو گئے۔ ایوب خان کے اقتدار کے آخری دنوں میں تو کراچی کی بسیں سیاسی پلیٹ فارم میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ آئے دن ہنگامے اور مار پیٹ کی وارداتیں ہوتیں۔ مسافروں کی اکثریت پیپلز پارٹی، بھاشانی نیپ کی حمایت میں بولتی، جب کہ چند افراد ایوب خان یا دوسری سیاسی پارٹیوں کی طرف داری میں دلائل دیتے۔

" دیکھا جمہوری مجلس عمل والوں کو، اقتدار کی بندر بانٹ میں ایوب خان جیسے بدترین آمر کی گود میں جا کر بیٹھ گئے۔"

" ارے بھائی انہیں عوام کے دکھ درد سے کیا کام، انہیں تو اقتدار کی کرسی چاہیئے ۔۔۔ موقع ملتے ہی لپکتے ہیں۔"

" کیا بھٹو صاحب اقتدار کے بھوکے نہیں ہیں۔ ایوب خان نے لفٹ نہیں دی تو ناراض ہو گئے اور گول میز کانفرنس کا بائیکاٹ کر دیا۔"

" میاں بھٹو اقتدار کا بھوکا نہیں ہے۔ اگر اقتدار کا بھوکا ہوتا تو وزارت پر لات مار کر باہر نہ نکل آتا ۔۔۔ تاشقند میں انگوٹھا لگا کر آ جاتا ۔۔۔"

" ارے تمہاری عقل پر تو پتھر پڑ گیا ہے۔ بھاشانی اور بھٹو ملک میں ہنگامہ کھڑا کر کے آگ لگانا چاہتے ہیں۔ دونوں اقتدار کے بھوکے ہیں"

" منہ سنبھال کر بات کرو جی ۔۔۔ پتھر تمہاری عقل پر پڑا ہو گا۔ تم تو ایوب خان کے چمچے ہو۔ ایسے ہی چمچوں نے پاکستان کو تباہ کیا۔"

" چمچہ ہے چمچہ ۔۔۔ مال ملتا ہو گا جبھی تو گن گا رہا ہے، اس کا۔"

" خبردار! جو مجھے چمچہ کہا ۔۔۔ ایوب خان میرا باپ نہیں لگتا، میں تو تم لوگوں کو سمجھا رہا تھا ۔۔۔"

" چپ بیٹھ چمچے بڑا آیا سمجھانے والا ۔۔۔ تیس مار خان کی اولاد ۔۔۔ چمچہ۔"

" گالی مت دو ورنہ بتاشے پھوڑ دوں گا ۔۔۔ کیا سمجھ رکھا ہے۔"

" چمچہ ہے بے ۔۔۔ خاموش بیٹھ۔"

اس ڈائیلاگ کے ساتھ ہاتھا پائی شروع ہو جاتی اور گالی گلوچ کا طوفان کھڑا ہو جاتا۔

یحییٰ خان کے دور حکومت میں مارشل لاء کے نفاذ کے باوجود لوگ اس قدر بیزار اور حالات سے تنگ آئے ہوئے تھے کہ بسوں میں دل کھول کر سیاسی صورت حال پر تنقید کرتے اور اپنے دل کی بھڑاس نکالتے تھے۔ بات چیت مقامی مسائل روشنی، پانی، گٹر، اسکول، ہسپتال، مہنگائی اور بے روزگاری سے شروع ہوتی اور سیاست

پاک بھارت جنگ کی

تازہ ترین خبریں

بسوں میں ملتی تھیں

سروے سے پتہ چلا ہے کہ نواحی علاقوں میں رہنے والے نچلے متوسط طبقے کے افراد اور مزدور سیاست میں زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں ان کے برعکس متوسط طبقے کے آسودہ حال لوگ سفر کے دوران سیاسی قسم کی گفتگو میں بہت کم حصہ لیتے ہیں۔ انہیں عام طور پر کنڈکٹروں سے شکایت رہتی ہے کہ بد اخلاقی سلوک کرتے ہیں اور "ابے تبے" سے بات کرتے ہیں۔ مگر وہ بات بڑھانے سے ہمیشہ پہلو بچاتے ہیں۔

کچھ لوگ تفریحاً خواتین کے حِصّے میں کھڑے ہو جاتے ہیں

پر ختم ہوتی ـــــ سوشلزم اور اسلامی نظام ان لوگوں کے پسندیدہ موضوعات بن گئے تھے۔ کچھ لوگ سوشلزم کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہتے "ـــــ سارا نظام دیکھ لیا اب سوشلزم کو بھی آزمالینا چاہیئے شاید ہمارے مسائل حل ہو جائیں "ـــــ کچھ لوگ کہتے "اجی چھوڑیے ساری خرابی اسلام کی رسی چھوڑنے سے پیدا ہوئی ہے۔ جس روز ہم اور آپ نے اسلام پر عمل شروع کیا ہمارے سارے مسائل چٹکیوں میں حل ہو جائیں گے۔ سوشلزم فریب ہے۔"

"میاں اتنے دنوں سے کس نے منع کیا تھا اسلام لانے کے لئے۔ اب تک اس ملک پر کون لوگ برسرِ اقتدار تھے۔ وہ اسلامی نظام کیوں نہیں لائے ـــــ سب بکواس ہے۔ اسلام کا بس نام رہ گیا ہے۔ وہ بھی ہم جیسے غریبوں کو دھوکہ دینے کے لئے۔"

"کفر مت بکو، توبہ کرو ـــــ اسلام سے یہی بیگانگی تو ہماری تباہی کا سبب بنی ـــــ"

"ارے بھائی تمہیں واعظ بننے کا شوق ہے، تو کسی مسجد کی راہ لو، ہمارا مغز کیوں چاٹتے ہو، ویسے ہی دماغ خراب ہے۔"

"اماں یہ جماعتیہ ہے جماعتیہ۔ اسی بات کی تنخواہ لیتا ہے چُپ کیسے کرے گا۔"

"خبردار جو مجھے جماعتیہ کہا ـــــ جس نے اسلام کی بات کی اُسے جماعتیہ قرار دے دیتے ہو، شرم کرو۔"

"ارے تم غیرت کھاؤ، اتنی دیر سے بک بک کئے جا رہا ہے۔ اسلام، اسلام کہاں ہے اسلام، جب کبھی غریبوں نے اپنے دکھ کی بات کی تمہارے جیسے چھٹکل اسلام کا نام لے کر ہمارا منہ بند کر دیتے ہیں اب ہمارا منہ بند نہ ہوگا۔ سامنے آنے والے کی ایسی کی تیسی بھیجا نکال کر رکھ دیں گے۔"

"چلو چلو بڑا آیا بھیجا نکالنے والا ـــــ دیکھ لیں گے۔"

"ابے تو چل، ابھی نکال کر رکھ دیں گے۔"

"نکال کر تو دیکھ تیری زبان کھینچ لوں گا۔"

تو ـــــ تو زبان کھینچے گا۔ ٹھہر تو جا تیری ـــــ"

دسمبر کی پاک بھارت جنگ کے دوران تازہ ترین خبریں بسوں میں ملتی تھیں۔ ہر مسافر دوسرے مسافر پر سبقت لے جانے کے لئے اپنی معلومات کا رُعب جھاڑتا نظر آتا تھا۔ اس بات پر جھگڑے، گالی



موسم گرما - جھگڑے اور فساد کا پیش خیمہ

گلوچ اور بعض اوقات مار پیٹ بھی ہو جاتی۔ شیخ مجیب الرحمٰن اور بنگالیوں کے خلاف بیشتر افراد بولتے تھے۔ کورنگی کی ایک بس میں چند افراد شیخ مجیب کی غداری کا شکوہ کرتے کرتے عام بنگالیوں کو گالی دینے لگے۔ ایک سنجیدہ مسافر نے انہیں منع کیا اور کہا اس میں عام غریب بنگالیوں کا کوئی قصور نہیں ـــــ قصور ہمارا ہے۔ ۲۴ سال سے ہم نے ان کی تکالیف کا خیال نہیں کیا۔ ہمارے یہاں کے بڑے بڑے سرمایہ دار انہیں لوٹتے رہے۔ اُن کے لیڈروں کو بار بار غدار اور وطن دشمن کہا گیا۔ ان ہی باتوں سے شیخ مجیب نے فائدہ اٹھایا اور انہیں ورغلانے میں کامیاب ہو گیا۔ بنگالیوں نے تمہارا کیا بگاڑا۔ وہ تو ہماری تمہاری طرح خود مشکلات کا شکار رہے۔"

"چُپ کرو جی، بڑے آئے بنگالیوں کے ہمدرد۔ یہ سالے کالے کلوٹے پیدائشی غدار ہوتے ہیں۔ موقع ملتے ہی اندرا کی گود میں چلے گئے۔ جنرل ٹکہ خان کو بلوایا نہ جاتا تو وہ ایک ایک بنگالی کو ٹھیک کر دیتا۔"

"بھائی ـــــ زمانہ بڑی ترقی کر گیا ہے۔ طاقت کی زبان زیادہ دیر نہیں چلتی۔ بنگالیوں پر مزید ظلم ڈھاؤ گے تو وہ بھی تمہیں ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہہ دیں گے۔"

"کہہ دیں کہتے ہیں تو ـــــ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے ـــــ ان کے لیڈر بھاشانی نے سلام علیکم تو کہہ ہی دیا۔ کیا فرق پڑا۔"

اس سنجیدہ فکر مسافر نے اپنے ہمسفروں کو سمجھانے کی مزید کوشش کی تو پہلے اُسے گالیوں سے تواضع کیا گیا۔ اس کے بعد دو تین مسافر اس سے الجھ گئے اور مُکا مار مار کر لہو لہان کر دیا۔ بیچارے کا ایک دانت ٹوٹ گیا۔ اور قمیض تار تار ہو گئی۔"

بسوں میں سفر کے دوران سیاسی نوعیت کے جھگڑوں کے علاوہ دوسری باتوں پر بھی جھگڑے ہوتے ہیں جن کی تفصیلات کا علم سروے کے دوران ہوا۔

کچھ افراد سفر کے دوران گھریلو تنازعہ نمٹانے کی کوشش میں ایک دوسرے سے اُلجھ جاتے ہیں۔ شادی، بیاہ، رخصتی، طلاق، لڑکے کی ناراضگی، لڑکی کی بے زبانی، ساس کا بُرا برتاؤ، سسر کی کلکل، جیسے امور پر زور زور سے باتیں کی جاتی ہیں۔ جس سے دوسرے مسافر لطف اندوز ہوتے ہیں یا بور ہوتے ہیں۔ اگر گفتگو کرنے والے فریقین میں سے ہوئے تو پھر یہ مسئلہ دھیرے دھیرے سنگین ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک طرف سے لڑکی کو بے گناہ قرار دیا جاتا ہے تو دوسرے طرف سے لڑکے کو معصوم قرار دینے کے لئے دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ اس گھریلو قسم کے بحث و مباحثہ کا نقطۂ عروج گالی گلوچ اور ہاتھا پائی پر ہوتا ہے۔

بسوں میں عموماً رش کے اوقات میں بے شمار افراد خواتین کے کمپارٹمنٹ میں گھس جاتے ہیں۔ عورتوں کو پریشان دیکھ کر کوئی "رحم دل مسافر" چیخنے لگتا۔ "اوے کنڈکٹر انہیں آگے سے ہٹاؤ۔ جسے دیکھو منہ اٹھائے زنانخانے میں گھسا چلا آتا ہے ـــــ شرم نہیں آتی ـــــ"

"اجی غیرت ہی ختم ہو گئی۔ جیسے ان کی ماں بہن تو بسوں میں سفر کرتی ہی نہیں ـــــ"

"یہ تو کنڈکٹر کا کام ہے کہ وہ عورتوں کے حصے میں مردوں کو نہ چڑھائے ـــــ ساری بدمعاشی تو انہی لوگوں کی ہے ـــــ"

"اگر کنڈکٹر بدمعاشی کرتے ہیں تو کیا ہماری آپ کی عقل گھاس چرنے گئی ہے۔ ہمیں بھی تو کچھ خیال کرنا چاہیئے۔ آخر سب کی

بنگالیوں کی حمایت کرنے پر ایک مسافر کا دانت توڑ دیا گیا

مائیں بیٹیاں ہیں۔"

"جناب کوئی کہاں تک خیال کرے، گھنٹہ گھنٹے ہو جاتے ہیں اسٹاپ پر۔ آخر سب کو ڈیوٹی پر پہنچنا ہوتا ہے۔ کوئی کہاں تک صبر کرے"

"یہ سب ٹھیک ہے، مگر عورتوں کا کچھ تو خیال رکھنا چاہیئے اب سامنے دیکھئے نا کس طرح لوگ عورتوں پر چڑھے جا رہے ہیں۔ توبہ توبہ۔"

"اماں بڑے میاں آپ نے کیا عورت عورت کی رٹ لگا رکھی ہے۔ بیٹھنے کو جگہ مل گئی۔ دوسرے جائیں بھاڑ میں ـــ"

"یار اس عمر میں پہنچنے کے بعد ہر آدمی خوفِ خدا میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہے" ـــ کوئی گرہ لگاتا ہے۔

بڑے میاں اس بات پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ اور کھڑے ہو کر اس آدمی کا گریبان پکڑ لیتے ہیں جو انہیں خوفِ خدا کا طعنہ دیتا ہے ـــ بس کے اندر چاروں طرف سے مارو ـــ مارو ـــ پکڑو ـــ پکڑو ـــ خبردار، رکیئے، ٹھہریے کا شور گونجنے لگتا ہے کنڈکٹر خاموشی سے ٹکٹ بانٹتا رہتا ہے ـــ

اس قسم کے جھگڑوں میں بعض اوقات کنڈکٹر اور ڈرائیور بھی ملوث ہو جاتے ہیں۔ کسی اسٹاپ پر بس کھڑی کر کے دونوں میدان کارزار میں کود پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی فیصلہ تھانے یا چوکی پر ہوتا ہے مگر اس کی نوبت کم ہی آتی ہے۔ اور معاملہ راستے ہی میں سلجھ جاتا ہے۔

ان دنوں بسوں میں شناختی کارڈوں پر بھی جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ کنڈکٹروں کو شکایت ہے کہ طلباء کی اس سہولت سے وہ لوگ بھی فائدہ اٹھانے لگے ہیں جو کسی کالج یا اسکول میں نہیں پڑھتے۔ بے شمار لوگوں نے جعلی کارڈ بنوا لئے ہیں اور وہ طالب علم بن کر طلباء کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں۔ ایک باریش بزرگوار نے بھی اسکول کا کارڈ بنوا لیا ہے۔ انہیں شرم دلاؤ تو ڈھٹائی سے کہتے ہیں "میاں علم کا کیا، کسی عمر میں سیکھو" ـــ جعلی کارڈوں کا رجحان عورتوں سے زیادہ مردوں میں ہے۔ چالیس چالیس سال کی عمر کے لوگ اسکول کا شناخت نامہ دکھاتے ہیں۔

شناختی کارڈوں کی چیکنگ کے دوران اکثر و بیشتر کارڈ ہولڈر اور کنڈکٹر میں جھگڑا ہوتا ہے۔ بداعتمادی کی وجہ سے حقیقی طالب علم بھی رگڑے میں آجاتے ہیں۔ اور بس کے اندر اچھا خاصا طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔

جھگڑے کی ایک اور وجہ بتائی گئی ہے۔ رش کے اوقات میں اگر بس کسی اسٹاپ پر زیادہ دیر رکتی ہے تو مسافر آوازیں کسنے لگتے ہیں۔

"ارے بس چلاؤ ـــ اندھے ہو دیکھتے نہیں پوری بس بھر چکی ہے ـــ چھت پر بٹھاؤ گے ـــ"

"بس تو بھر چکی اُن کا پیٹ ابھی نہیں بھرا۔"

"اجی اُن کا پیٹ تو قیامت تک نہیں بھرے گا۔"

"تو کیا قیامت تک گاڑی یہیں کھڑی رہے گی۔"

"ڈرائیور صاحب اب تو چلا ہی دو ـــ گھر پہنچنا ہے ـــ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں ـــ"

"بہرا ہے بھائی بہرا ـــ"

"چرسی ہے ـــ چرسی ـــ"

"ابے کیا سیٹ پر اونگھ گیا بھائی ـــ"

کنڈکٹر یا ڈرائیور نے اس قسم کے ریمارک کا جواب دینے کی کوشش کی تو نتیجہ آپ سب پر ظاہر ہے۔ ہنگامہ، مار پیٹ ـــ گالی گلوچ۔

بسوں میں بعض اوقات کنڈکٹر یا مسافر کی بدمزاجی کی وجہ سے بھی جھگڑے کا شاخسانہ نکل آتا ہے۔ کنڈکٹر زیادہ سے زیادہ مسافروں کو سمیٹنے کے لئے بس کے اندر مسافروں کی تہیں جماتا ہے۔ مسافر اس کے لئے تیار نہیں ہوتے لیکن مجبوراً وہ خاموش رہتے ہیں۔ البتہ کوئی چڑچڑا مسافر الجھ جاتا ہے "ہم انسان ہیں کوئی بھیڑ بکری نہیں جو تم تلے اوپر دباتے چلے جا رہے ہو۔"

"ایک طرف ہو جاؤ۔ دوسرے کو آنے دو۔"

"کہاں ہو جاؤں۔ جگہ کہاں ہے۔"

"ارے تم ایک طرف تو ہٹو۔" کنڈکٹر مسافر کا کندھا پکڑ کر ایک جانب دھکیلتا ہے۔ مسافر کنڈکٹر کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر الجھ جاتا ہے۔ اس دھکم پیل میں کھڑے ہوئے مسافر بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے پر الٹنے لگتے ہیں۔ پوری بس میں افراتفری اور سراسیمگی کی کیفیت پھیل جاتی ہے۔ کوئی دبلا پتلا مسافر گھٹی گھٹی آواز میں چیختا ہے۔

"خدا توفیق دے تو بس میں کبھی کوئی سفر نہ کرے۔"

وڈیرے کے کمدار نے ہاری کی بیوی کو اغوا کرلیا

الفتح رپورٹ

وہ ایک ہاری تھا، اس کے چہرے پر پھیلا ہوا کرب کا جال اس کے اندوہ ناک ماضی کا عنوان تھا۔ اس کے بازوؤں کی ابھری ہوئی نسیں، اندر کو دھنسی ہوئی غمگین آنکھیں دکھوں کی داستان سنا رہی تھیں کہ جب اس نے اپنی زندگی کی آدھی منزل طے کرلی تو دکھوں کی دولت نے اسے مالا مال کردیا۔

یہ کسی افسانہ کا ابتدائیہ ہے اور نہ کسی تمثیل کا منظرنامہ بلکہ یہ اس محنت کش کی سچی داستان حیات ہے جو گرمی ہو یا سردی چوبیس گھنٹے محنت اور مشقت کرتا ہے۔ اپنے خون پسینہ سے زمین کو زرخیز بناتا ہے۔ سونے جیسی فصلیں اگاتا ہے تاکہ کوئی بھوکا نہ رہے، کوئی بھوک سے دم نہ توڑ دے۔ لیکن جب فصل تیار ہوتی ہے، تو وڈیروں کے گوداموں کی زینت بن جاتی ہے۔ ہاری ..... فصل کا خالق بھوکا رہتا ہے۔ قوم بھوکی سوتی ہے۔ کیونکہ یہ فصل، یہ اناج فروخت کرکے وڈیرے معجون مرکب اور طاقت کی دوائیاں حاصل کرتے ہیں۔ سدا جوان رہنے کیلئے، عیاشی کیلئے۔

سندھی وڈیروں کا ستایا ہوا یہ مظلوم ہاری، پٹھان نہیں ہے، بلوچ نہیں ہے، پنجابی نہیں ہے۔ یہ سندھی ہے۔ اس صوبے کا باسی ہے جہاں "جئے سندھ" اور "سندھو دیش" کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ جہاں محنت کش عوام کو پٹھانوں، بلوچیوں اور پنجابیوں کے خلاف بھڑکایا جاتا ہے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ پٹھان، پنجابی، بلوچ اور مہاجر غاصب ہیں۔ انہوں نے سندھیوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ اس طرح سندھی ہاری کو نئے سندھی ہاری سے لڑواتے ہیں۔ حالانکہ خود سندھی وڈیرے، مہاجر پٹھان، پنجابی اور بلوچی وڈیروں کے دوست ہیں، ایک دوسرے کی دعوتیں کرتے ہیں۔ شادی بیاہ میں شریک ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان سب کا مقصد ہاریوں اور محنت کشوں کا استحصال کرنا ہے۔ لوٹ کھسوٹ کرنی ہے۔ سندھی وڈیرہ ہاری کا استحصال کرتے وقت سندھی ہاری اور نئے سندھی ہاری میں تمیز نہیں کرتا۔

یہ مظلوم ہاری ..... خداڈینہ گوٹھ عامری کا رہنے والا ہے۔ عامری سیہون سے ۲۲ میل اور سن سے ۱۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ خداڈینہ نے جب ہوش سنبھالا تو اس کا باپ۔ اچھر فوت ہوچکا تھا چنانچہ دربدر کی ٹھوکریں کھائیں۔ رشتے داروں نے بھولے منہ بھی کبھی خیریت معلوم کی۔ کبھی اس کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو اس نظام کی روایت کے مطابق ہاری بن گیا۔ کیونکہ اس جاگیردارانہ نظام میں ہاری کا بیٹا ہاری اور وڈیرے کا بیٹا وڈیرہ بنتا ہے۔ اور جو بھی اس روایت کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے اس پر زندگی حرام کردی جاتی ہے۔

خداڈینہ وڈیرے کی اراضی پر کام کرتا، ہل چلاتا، دن بھر محنت کرتا، شام کو وڈیرے کے گھر پر کام کرتا اور رات کو فصل کی رکھوالی کرتا۔ غرض ۲۴ گھنٹے کام کرتا۔ زندگی کے شب و روز اسی طرح بیتیے گئے۔ جب وہ جوان ہوا۔ تو انسانی فطرت کے مطابق شادی کی خواہش ہوئی۔ ادھر ادھر رشتہ تلاش کیا۔ لیکن کوئی اپنی بیٹی دینے کو تیار نہ ہوا۔ کیوں کہ خداڈینہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا تھا، اس کی کوئی بہن نہیں تھی۔ سندھ کے دیہاتوں میں یہ رواج ہے، جب تک رشتے کے عوض رشتہ نہیں ملتا، شادی نہیں ہوسکتی۔

جب کوئی رشتہ نہ ملا تو خداڈینہ اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں گیا۔ قرآن کا واسطہ دے کر اس کی لڑکی کا رشتہ مانگا۔ قرآن شریف کو دیکھ کر لڑکی کا باپ خاموش ہوگیا، اور لڑکی کے بدلے لڑکی کی رسم توڑ دی، اور خداڈینہ سے کچھ شرائط منوا کر اپنی بیٹی کی شادی اس سے کردی۔

شادی کے بعد خداڈینہ اور اس کی بیوی کی زندگی سکون سے گزرنے لگی، خداڈینہ منہ اندھیرے کھیتوں پر چلا جاتا، اس کی بیوی گھر کی صفائی کرتی، کپڑے دھوتی، اور پھر دوپہر کا کھانا لے کر کھیتوں پر چلی جاتی، دونوں اس زندگی سے خوش تھے۔ کہ اچانک خداڈینہ کے چچا محمد نے اس معصوم گھرانے کی زندگی میں زہر گھول دیا۔ اور اسے دکھوں سے مالا مال کردیا۔

خداڈینہ کا چچا محمد، جی۔ ایم۔ سید کے بھتیجے امام بخش شاہ کا کمدار ہے۔ امام بخش شاہ ہاریوں پر ظلم و ستم کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا، جو آواز اٹھاتا ہے جوتوں سے اس کی خوب خاطر مدارت کرتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ کشتی گھاٹ کا ٹھیکہ جو قانوناً مقامی ملاحوں کو ملنا چاہیئے، امام بخش شاہ ملاحوں کے فرضی ناموں سے لے لیتا ہے۔ کیونکہ حکام سے اس کا گہرا یارانہ ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ سال گذشتہ ایک بڈھو کے نام سے سن کے گھاٹ کا ٹھیکہ لیا۔ ٹھیکے کی رقم کی قسطیں ادا نہیں کیں۔ مشہور کیا کہ بڈھو کا انتقال ہوگیا ہے اس لئے قسطیں ادا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر ڈسٹرکٹ کونسل کے حکام سے مل کر معاملہ طے کرلیا۔ حالانکہ بڈھو ابھی تک زندہ ہے۔ جھیلوں پر مچھلیاں پکڑنے کا ٹھیکہ، جنگلات کا ٹھیکہ بھی اسی طرح لیتا ہے۔ لال شہباز قلندر کے مزار کے زیارت ٹیکس کا ٹھیکہ بھی لیا تھا۔ لیکن زائرین سے دوگنا تگنا ٹیکس وصول کرنے پر یہ ٹھیکہ منسوخ کردیا گیا۔ اپنی ان بدعنوانیوں کو چھپانے کیلئے وہ پاکستان پیپلز پارٹی میں بھی شامل ہوگیا۔ خداڈینہ کا چچا محمد اسی امام بخش شاہ کا کمدار ہے۔ ظاہر ہے کہ محمد بھی اپنے آقا سے کسی طرح کم نہیں۔

محمد خداڈینہ کی شادی سے قبل کبھی اس کے گھر نہیں آیا تھا، نہ خداڈینہ کو اپنے ہاں بلایا تھا۔ دونوں میں بات

پچیت بھی نہیں تھی۔ لیکن جب خدا ڈینہ کی شادی ہوگئی تو ایک دن اچانک محمد اس کے گھر پہنچا، اور خدا ڈینہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ "مجھ سے غلطی ہوئی ہے معاف کردو۔ آج سے میں تمہارا باپ ہوں"۔ خدا ڈینہ.... سیدھا سادہ ہاری اس جال میں آگیا۔ محمد کو اپنا باپ سمجھنے لگا کہ چلو آج چچا کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ پھر محمد اکثر و بیشتر خدا ڈینہ کے گھر آنے لگا۔ گوٹھ کے بڑے بوڑھوں نے خدا ڈینہ کو سمجھایا کہ محمد وڈیروں کا پٹھو ہے، یہ تمہیں نقصان پہنچائیگا۔ اسے گھر مت آنے دو...... لیکن خدا ڈینہ نے اس بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ اس کا خیال تھا کہ چچا مجھے نقصان کیوں پہنچائے گا۔ میں نے اس کی ہمیشہ عزت کی ہے۔ پھر وہ میرا بُرا کیوں چاہے گا۔

ایک دن محمد خدا ڈینہ کے گھر پہنچا اور اس سے کہا کہ "تمہاری بیوی میری بیٹی ہے۔ اسے ایک ہفتہ کے لئے میرے گھر بھیج دو"۔ خدا ڈینہ نے ایک ہفتہ کی بجائے دو ہفتے کی اجازت دے دی۔ محمد اس کی بیوی کو لے کر چلا گیا۔ پندرہ دن کے بعد جب خدا ڈینہ اپنی بیوی کو واپس لینے محمد کے گھر گیا تو محمد نے کہا کہ اتنی جلدی کیا ہے۔ تمہاری بیوی کے آنے سے میرے گھر کی رونق بڑھ گئی ہے۔ ایک ہفتہ اور رہنے دو...... خدا ڈینہ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا اسنے اجازت دے دی۔ لیکن جب سات روز کے بعد وہ دوبارہ اپنی بیوی کو لینے گیا تو اس کے چچا محمد نے کہا کہ تمہاری بیوی تمہارے ساتھ جانے کو تیار نہیں۔ کہتی ہے میں اپنے شوہر کے گھر نہیں جاؤں گی۔ خدا ڈینہ نے اپنی بیوی کو بلوایا اور چچا کے الفاظ کی تصدیق چاہی۔ اس کی بیوی نے انکار کیا نہ اقرار۔ خاموش کھڑی حسرت کی نگاہوں سے اسے تکتی رہی۔

خدا ڈینہ نے واپس آکر گوٹھ کے بڑے بوڑھوں سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ اور مدد مانگی۔ چنانچہ ہاریوں کا ایک وفد محمد سے ملا۔ غیرت دلائی کہ تم خدا ڈینہ کی بیوی کو بیٹی کہتے ہو لیکن کر کیا رہے ہو۔ اس پر محمد نے کہا کہ پرسوں آکر خدا ڈینہ کی بیوی کو لے جانا، لیکن اس نے وعدہ پورا نہیں کیا...... آج، کل پر ٹالتا رہا۔ اس کے بعد امام بخش شاہ کے پٹھوؤں نے گوٹھ والوں سے کہا کہ اگر تم پانچ سو روپے امام بخش شاہ کو دے دو تو خدا ڈینہ کی بیوی کو واپس کردیا جائے گا۔ گوٹھ والوں نے چندا جمع کر کے پانچ سو روپے دے دیئے۔ لیکن خدا ڈینہ کی بیوی پھر بھی نہ ملی۔ اس طرح پانچسو روپے بھی خاک میں مل گئے۔ پھر خدا ڈینہ امام بخش شاہ کے پاس گیا۔ اور خدا، رسول کا واسطہ دیا۔

قرآن کو اٹھا کر واسطہ دیا۔ لیکن امام بخش پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے جوتوں سے خدا ڈینہ کی مرمت کی۔ اور اپنے گھر سے باہر نکال دیا۔

اس کے بعد گوٹھ کے ہاریوں نے فیصلہ کیا کہ پاکستان پیپلز پارٹی سے مدد لی جائے۔ وہ پیپلز پارٹی کے ہر جلسے میں جاتے اور اس اندوہناک واقعہ کی تفصیلات بتاتے۔ انہوں نے جناب ذوالفقار علی بھٹو، میر رسول بخش تالپور، مخدوم محمد زماں، ملک سکندر، عبدالحمید جتوئی، غلام مصطفےٰ جتوئی، پیر غلام رسول شاہ، عبداللہ شاہ، غرض پیپلز پارٹی کے ہر رہنما کو اپنا قصۂ درد سنایا۔ لیکن جواب ملا کہ اس وقت ہم انتخابات میں مصروف ہیں۔ انتخابات کے بعد تمہاری بھرپور مدد کریں گے۔ خدا ڈینہ کو اس کی بیوی ضرور ملے گی۔ لیکن ابھی صبر و تحمل سے کام لو۔

اسی عرصہ میں خدا ڈینہ کی مخالف پارٹی نے اس پر تنسیخ نکاح اور چوری کا مقدمہ دائر کردیا۔ دوسری طرف

پیپلز پارٹی والوں نے کہا:

"انتخابات جیت لینے دو، ہم تمہاری بیوی واپس دلوا دیں گے"

خدا ڈینہ کے پاس اس کی بیوی کے خفیہ پیغام آئے کہ۔ "میں مجبور ہوں، مجھے جان سے مارنے کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ میرے اوپر کڑی نگرانی رکھی جاتی ہے۔ مسلح افراد پہرہ دیتے ہیں۔ میں عورت ذات ہوں، کچھ کہہ نہیں سکتی۔ لیکن تم تو مرد ہو۔ مجھے ان سے نجات دلاؤ"۔ مقدمات اور بیوی کے پیغاموں نے خدا ڈینہ کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ اس کا جینا دوبھر ہوگیا۔

دشمن نے ایک اور چال چلی۔ افواہ پھیلا دی کہ عدالت سے خدا ڈینہ اپنی بیوی کو لے کر فرار ہوگیا ہے۔ یہ بالکل جھوٹ تھا۔ لیکن اس افواہ کا مقصد گوٹھ کے ہاریوں کو تنگ کرنا تھا تاکہ وہ خدا ڈینہ کی حمایت ترک کر دیں۔ اس افواہ کے چند دن بعد جنوری ۱۹۷۱ء کے پہلے ہفتے میں ایک دن خدا ڈینہ کا چچا اور اس کا لڑکا غلام رسول پولیس کو لے کر گوٹھ میں آیا۔ پولیس پارٹی کی قیادت ایک اے۔ ایس۔ آئی کر رہا تھا۔ اس وقت تمام ہاری کھیتوں پر تھے۔ گھروں میں عورتوں اور چھوٹے بچوں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ پولیس تلاشی کے وارنٹ کے بغیر ہاریوں کے گھروں میں داخل ہوگئی۔ عورتوں کو بتایا کہ وہ خدا ڈینہ کی بیوی کو تلاش کر رہی ہے.... یہ اسی تھانے کی پولیس تھی جہاں خدا ڈینہ کی سینکڑوں درخواستیں پڑی ہیں کہ مجھے محمد سے میری بیوی دلوائی جائے۔ لیکن اس

وقت پولیس لسٹ سے مس نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ ایک وڈیرے کمدار کی غلط رپورٹ پر گھروں کی تلاشی لے رہی تھی۔ حالانکہ اس کے پاس تلاشی کا وارنٹ نہیں تھا۔

جب پولیس خدا ڈینہ کی بیوی کی تلاش میں ناکام رہی تو اس نے ایک اور نوجوان عورت کو زبردستی لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔ عورتوں نے شور مچا دیا۔ اسی دوران میں فضل نامی ایک نوجوان لڑکا وہاں پہنچ گیا۔ وہ بی۔ اے پاس تھا۔ اس لئے اس نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ آپ ہمارے محافظ ہیں۔ ہماری حفاظت آپ کا فرض ہے۔ آپکو تنخواہ اسی بات کی ملتی ہے۔ لیکن آپ ہماری ماؤں بہنوں کی بے عزتی کر رہے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف اور قانون ہے۔ اے۔ ایس۔ آئی کو ایسی باتیں سننے کی بھلا کہاں تاب تھی۔ اس لئے فوراً فضل کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ جھگڑا ابھی جاری تھا کہ غلام محمد اور اللہ بچایا نامی دو ہاری موقع پر پہنچ گئے۔ انھیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن اسی عرصے پولیس

کی آمد اور گوٹھ کی ماؤں، بہنوں کی بے عزتی کی خبر پورے گوٹھ اور کھیتوں میں پھیل چکی تھی۔ اب یہ خدا ڈینہ کا مسئلہ نہیں تھا۔ پورے گوٹھ کی عزت کا معاملہ تھا۔ جس ہاری نے یہ واقعہ سنا، اس نے کلہاڑی اٹھائی، کسی نے ڈنڈا، کسی نے اینٹ پتھر اٹھایا اور سو سے زیادہ ہاری گھروں کی جانب چل دیئے۔ پولیس کو اطلاع ملی تو وہ خائف ہو کر فرار ہوگئی۔

اس واقعہ کے فوراً بعد ہاریوں نے فیصلہ کر کے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ رکن صوبائی اسمبلی عبداللہ شاہ سے ہاریوں کا ایک وفد ملا۔ انہوں نے امداد کا یقین دلایا۔ ایک وفد جی۔ ایم۔ سید سے ملا اور انہیں بتایا کہ محمد کمدار اور خدا ڈینہ کی بیوی تمہارے گاؤں میں رہتے ہیں۔ خدا ڈینہ کو اس کی بیوی واپس دلوائی جائے۔ جی۔ ایم۔ سید نے جواب دیا کہ "یہ میرا کام نہیں ہے عورتوں کے اغوا یا بھاگ جانے کے معاملوں کا فیصلہ کرنا سندھی وڈیروں کا کام ہے۔ میں تو پورے سندھ اور سندھی قوم کے مسائل حل کرنے کی کوشش میں مصروف ہوں"۔

خدا ڈینہ کا مقدمہ ابھی تک زیر سماعت ہے۔ ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر گیا ہے، لیکن ابھی تک چھ گواہوں میں سے صرف تین کے بیانات ریکارڈ کئے گئے ہیں۔

باقی صفحہ ۵۰ پر ملاحظہ فرمایئں

تان اڑانے والوں نے
بھائی کو بھائی سے لڑوا دیا



علی جمال

آج کے نام

اور ....

آج کے غم کے نام
آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستان سے خفا !
زرد پتوں کا بن
زرد پتوں کا بن جو مرا دیس ہے
درد کی انجمن جو مرا دیس ہے

یہ دردمندِ دل کی تڑپ کل بھی سچ تھی اور آج بھی سچ ہے۔ مرا دیس کل بھی درد کی انجمن تھی اور آج بھی درد کی انجمن ہے اور آج کا غم زندگی کے بھرے گلستان سے خفا ہے کہ مرا دیس کل بھی جل رہا تھا اور آج بھی جل رہا ہے۔ جنتا کے رکھوالے کل بھی جب دیس ہر سو نفرت، بے اعتمادی اور غیر یقینی کی آگ میں جل رہا تھا۔ آج بھی مرا دیس جب کہ نفرت بے اعتمادی اور غیر یقینی کی آگ میں جل رہا ہے اپنی اپنی بانسری بجا رہے ہیں۔ ان کی اپنی اپنی الگ بانسریوں کی تانوں کا گھاؤ کل بھی جنتا کو بے کل کئے ہوئے تھا اور آج بھی جنتا کو پریشان کیے ہوئے ہے۔ کل بھی جنتا بھوکی تھی اور آج بھی جنتا بھوکی ہے۔ کل بھی جنتا برہنہ تھی آج بھی جنتا برہنہ ہے۔ کل بھی جنتا بے گھر تھی، آج بھی جنتا بے گھر ہے۔

کل بھی جنتا کے غم سے سب غافل تھے آج بھی جنتا کے غم سے غافل ہیں۔ سب اپنے غم میں مگن ہیں اور ان کی بانسری کی تانوں میں جنتا کے غم کا، دیس کے غم کا کوئی انگ، کوئی رنگ نہیں۔

کل جب دیس جل رہا تھا بانسریوں والے بانسریاں بجا رہے تھے :-

"اقتدار مجیب کے حوالے کر دو، یہی جمہوریت کا تقاضا ہے — !"

"چھ نکات کو تسلیم کرنے میں پاکستان کی نجات ہے !"

"فوج کو بیرکوں میں واپس بھیج دو — !"

"بات صرف اسمبلی میں ہو سکتی ہے"

"ہم اسمبلی سے باہر بات کریں گے۔ اگر یہ نہیں کرتے تو اسمبلی کی مدت بڑھاؤ !

"ہم جنتا کے حقوق کا سودا نہیں کریں گے"

اقتدار نہ مجیب کو ملا اور نہ چھ نکات مانے گئے جن میں پاکستان کی "نجات" پوشیدہ تھی۔ فوج بیرکوں میں نہیں گئی۔ نہ مارشل لاء ختم کیا گیا نہ اسمبلی بلوائی گئی۔ نہ بات اسمبلی کے اندر ہوئی۔ اور اسمبلی کے باہر کی باتیں باہر ہی رہ گئیں کیونکہ اسمبلی بلوانے والے ۲۵ دن کے التوا کا انتظار نہ کر سکے اور دیس خون میں نہا گیا۔ سو

پھر وہاں باب اثر جانیے کب بند ہوا !
پھر یہاں ختم مناجات نہ ہونے پائی !

اور اپنے دیس کی حفاظت کرنے والے اپنی ہی دھرتی پر پا بجولاں کر دیئے گئے۔ کیونکہ چھ نکات تسلیم کرنے میں پاکستان کی نجات پوشیدہ تھی اور یہ سب کچھ چھ نکات کا علم اٹھانے والوں اور اقتدار مجیب کے حوالے کرانے والوں کے کارن ہوا۔

ایک خوں چکاں باب ختم ہوا
درد کا اک اور باب کھلا

"ہم ٹکے چنیں گے۔ ہم سب مل کر چھوٹے چھوٹے ٹکے چنیں گے، بہت چھوٹے بھی ! ہم ایک عظیم دیس کی تعمیر کریں گے جو انسان پر انسان کے استحصال سے آزاد ہو گا — !"

"مجیب کو رہا کرو — !"

"جنگی قیدیوں کو واپس لاؤ !"

"مارشل لاء ختم کرو — !"

"شراب بند کرو — !"

"جمہوریت بحال کرو — !"

"جمہوریت کے قائد الطاف گوہر کو رہا کرو"

مجیب کو رہا کر دیا گیا۔ مجیب نے کہا — "مجھے تسلیم کرو، میں بنگلہ دیش ہوں۔ یہی میرے چھ نکات تھے۔ میں پچیس سال سے اس کے لیے کام کر رہا تھا۔

مجیب کو اقتدار حوالے کرنے کی تان اڑانے والے بولے — "بنگلہ دیش کو تسلیم کرو، اسی میں ہی پاکستان کی نجات ہے۔"

لیکن جنتا نے تو طبقاتی استحصال سے نجات چاہی تھی، روٹی، کپڑا، مکان مانگا تھا۔ جنتا کے مسائل کا حل مجیب کو رہا کرنے، بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے، یا مارشل لاء کو ہٹانے اور جمہوریت کی بحالی میں نہیں تھا۔ یہ بانسریاں بجانے والوں کا مسئلہ تھا۔ جنتا استحصالی نظام کا خاتمہ چاہتی تھی، اصلاحات کی خواہاں تھی، اصلاحات کا باب کھلا اور یکے بعد دیگرے زندگی کے ہر میدان میں بنیادی تبدیلیوں کی نشاندہی کی گئی۔

تا ہمیں ارشیں۔ ملک کے وسائل ان اصلاحات کے متحمل نہیں۔ یہ سب سراب ہے۔ ہم آدھے پاکستان کے مالک ہیں، ہم مجیب نہیں ہیں، ہم اپنے عظیم تر طبقاتی مفادات پر اصلاحات کی پرچھائیاں نہیں پڑنے دیں گے۔ ہم گولی چلانا جانتے ہیں۔ ہمارا نشانہ بڑا ٹھیک ہے۔ ہم دھرتی کے بیٹے ہیں"

جواب آیا — "ہم بھی گولی چلانا جانتے ہیں۔ ہم بھی اسی دھرتی کے بیٹے ہیں۔ ہمارا نشانہ بھی اتنا ہی ٹھیک ہے۔"

لیکن جنتا بیچاری ان تانوں کے رنگ انگ میں خون کی لکیریں بنتی دیکھ رہی تھی، سہمی ہوئی تھی، ڈری ہوئی تھی، لرزاں تھی کہ مژدہ سنایا گیا ——— "سب ٹھیک ہے، ہم تینوں ایک ہیں یہ جمہوریت کی فتح ہے ——— !"

پھر یکایک مارشل لاء بھی ہٹا دیا گیا۔ زمین بے دستور کو عبوری دستور ملا۔ سب نے یک زبان ہو کر لبیک کہی۔ ——— "بھٹو عظیم ہے۔ پیپلز پارٹی نے ایک عظیم لیڈر پیدا کیا ہے۔ یہ جمہوریت کی فتح ہے۔"

جنتا سمجھی۔ اب اصلاحات کے باب پر عمل شروع ہو گا لیکن تان اڑانے والوں نے اور تانیں لگا کر بھائی کو بھائی سے لڑوایا، مزدور کو آجر سے، اصلاحات کو بوگس قرار دیا۔ دوبارہ عام انتخابات کا نعرہ لگایا اور بدامنی کی آگ بھڑکائی۔

لیکن جنتا تب بھی بھوکی رہی۔ جنتا تب بھی برہنہ رہی، جنتا بے گھر رہی۔

پھر پارلیمانی جمہوریت، آزادی اور آزادیٔ صحافت کی تانیں اڑائی گئیں، جیسے ان تانوں کا معاوضہ جنتا کے لیے روٹی کپڑا اور مکان ہے

ایک اور مُرلی بجی

"بھٹو کو اقتدار سے ہٹا دو! ہم گلی گلی، کوچہ کوچہ، کوچہ میں یہ مہم چلائیں گے، ہم بھٹو سے انتقام لیں گے۔"

"ہم دیش کے مفادات کا سودا نہیں کریں گے، ہم امن چاہتے ہیں۔ ہمیں تنکے چننا ہیں، ہمیں دیس کی تعمیر کرنی ہے ہمیں معاشرے کو استحصال سے پاک کرنا ہے۔"

شملہ معاہدہ اس سمت ایک اہم قدم قرار دیا گیا۔

لیکن مُرلی بجانے والوں نے کہا:-

"شملہ معاہدہ فراڈ ہے، اعلانِ تاشقند سے بھی بدتر ہے ——— !"

جنتا کے پلے کچھ نہیں پڑ رہا۔ جنتا سوچ رہی ہے کہ ان بنسریوں کی تانیں کب بند ہوں گی۔ لیکن ایک اور "تان" اڑی۔ یہ تان یومِ بابرٹہ کی "تان" تھی۔

فضا میں کھلبلی مچی ...!

لیکن جنتا کے درد میں ڈوبی ہوئی ایک آواز آئی۔ بنسریوں کے تانوں کی بھی ایک حد ہوتی ہے، ایک انگ ہوتا ہے۔ ایک رنگ ہوتا ہے۔ بہت بنسریاں بج چکیں ——— آؤ مل کر ایک ہی بنسری بجائیں۔ ایک ہی تان اڑائیں ——— جنتا کے لیے .... صرف جنتا کے لیے،

جنتا اس آواز پر کان دھرے بیٹھی ہے، آس لگائے بیٹھی ہے۔

یہ آواز ایک دردمند، ہوش مند آواز تھی۔ تینوں پھر اکٹھا ہونے کے لیے ملے تاکہ تینوں ایک ہی تان اڑائیں ——— جنتا کے لیے ——— نجانے یہ تان کب سب تانوں پر بھاری ہو ——— آج کا غم زندگی کے بھرے گلستان سے خفا نہ ہو۔

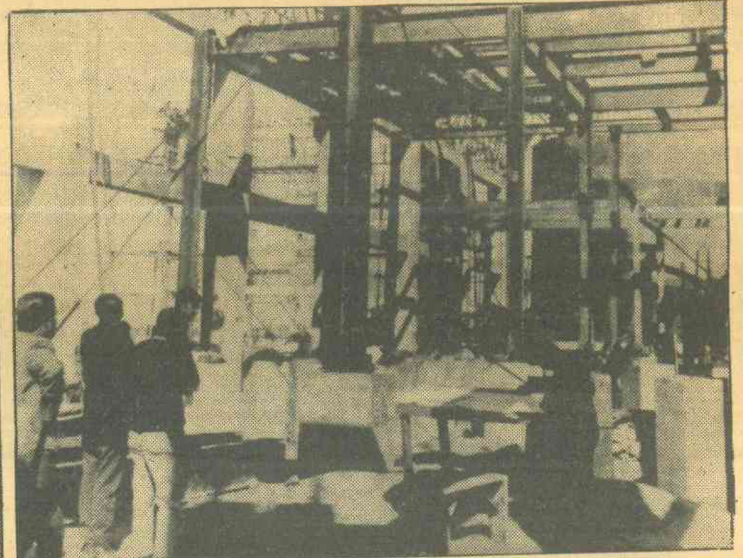
بقیہ: ظلم و تشدد کی کہانیاں

اب محمد کمدار اور اس کے بیٹے نے خدا ڈینہ کے حمایتیوں کو طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہاریوں کا ایک وفد جناب ممتاز علی بھٹو سے بھی ملاقات کر چکا ہے۔ انہوں نے ہدایت کی کہ ایس۔ پی۔ اور ایس۔ ڈی۔ ایم سے رجوع کیا جائے۔ چنانچہ ہاری ان دونوں افسروں سے ملے لیکن آج تک مسئلہ جوں کا توں ہے۔

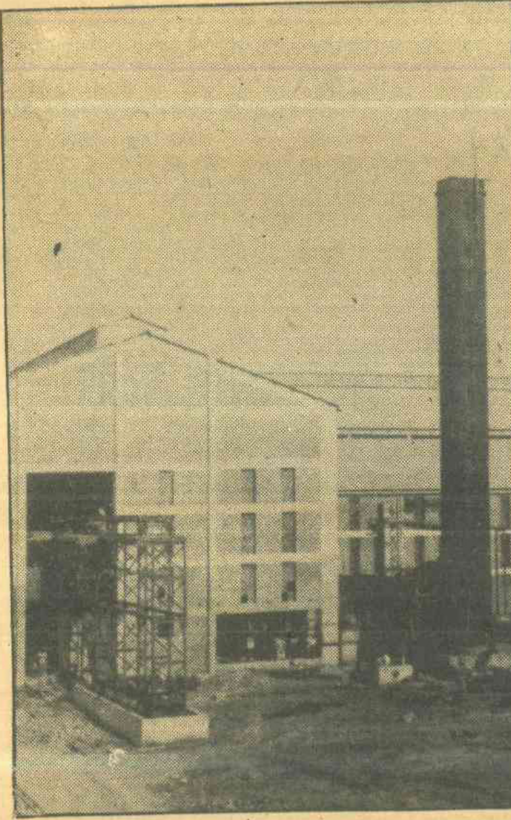
ہاریوں کا ایک دوسرا وفد سندھ پیپلز پارٹی کے اور صوبائی حکومت کے ایک اعلیٰ عہدیدار سے ملا، تو انہوں نے فرمایا کہ ...... "ہاریوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی عورتوں کو قابو میں رکھیں۔ اگر کسی کی عورت بھاگ جائے تو یہ حکومت کی ذمہ داری نہیں ہے۔"

اس دوڑ دھوپ کے باوجود خدا ڈینہ کو آج تک انصاف نہیں مل سکا۔ وہ اب مایوس ہو چکا ہے۔ زندگی سے بیزار ہے۔ یہ ظلم صرف ایک ہاری خدا ڈینہ پر نہیں ہوا۔ سندھ میں ایسے بے شمار واقعات رونما ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اور یہ اس وقت تک ہوتے رہیں گے۔ جب تک یہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام باقی ہے۔

الفتح



ملز کا ایک
اندرونی منظر



رحمانیہ شوگر ملز کا ایک منظر

رحمانیہ شوگر ملز کے مزدوروں کے حسین خواب منتشر ہو گئے

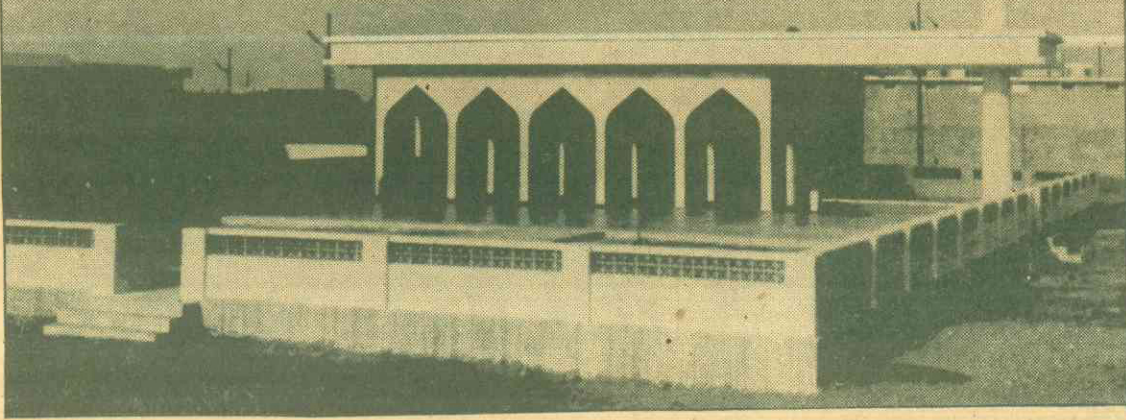
پاکستان پیپلز پارٹی نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ملک کی بنیادی اور بھاری صنعتوں کے ۳۲ ادارے سرکاری تحویل میں لے لئے۔ یہ اقدام پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نے اپنے منشور کے اُس اقتصادی پروگرام کے تحت کیا جس میں بنیادی اور بھاری صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ تاکہ انسانی محنت کا استحصال بند کیا جائے۔ ——— ان صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لینے سے محنت کشوں کا استحصال بند نہ ہو سکا۔ کیونکہ مالکان کے حصص باقی ہیں، وہ منافع کے حق دار ہیں۔ صرف مینجنگ ایجنسیاں توڑ دی گئی ہیں۔ اس طرح انسانی محنت کا استحصال براہ راست ہونے کی بجائے بالواسطہ ہو گیا اور وطن عزیز میں نوکر شاہی کا اثر و رسوخ اور تسلط مزید بڑھ گیا۔ یہ وہی نوکر شاہی ہے جس نے اس ملک میں جمہوریت کو پروان چڑھنے نہیں دیا بلکہ خود حکمران بن بیٹھی۔ برطانوی نوآبادکاروں کی تربیت یافتہ یہ نوکر شاہی عوام کو ایک حقیر کیڑے سے بھی کم اہمیت دیتی ہے۔

جن صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لینے کا اعلان کیا گیا۔ اُن میں شکر سازی کی صنعت شامل نہیں تھی۔ بالفاظ دیگر شکر سازی کی صنعت بدستور نجی شعبہ میں رہی۔ لیکن ۲۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مارشل لاء کے ضابطہ ۱۰۳ کے تحت رحمانیہ شوگر ملز کھوسکی پرانی انتظامیہ کی تحویل



رحمانیہ شوگر ملز کی مزدور کالونی

سابق انتظامیہ کی بحالی کیلئے پیپلز پارٹی کے آٹھ چیئرمینوں کی اپیل



سے لے کر فوجی فاؤنڈیشن کے حوالے کردی گئی۔

چونکہ مارشل لاء کے ضابطہ میں اس امر کی کوئی وضاحت نہیں تھی کہ آخر وہ کیا اسباب اور حالات تھے جن کی وجہ سے یہ ملز فوجی فاؤنڈیشن کے حوالے کی گئی۔ اس لئے ہم نے رحمانیہ شوگر ملز دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ گزشتہ ہفتے کی صبح ساڑھے چھ بجے بذریعہ کار روانہ ہوئے۔ الطاف رانا پریس فوٹو گرافر بھی ساتھ تھے ٹھٹھہ کی شاہجہانی مسجد کے پاس ایک سنگ میل نظر آیا۔ جس پر لکھا تھا "کھوسکی ۸۲ میل" ہمیں خدشہ تھا کہ کھوسکی کو جانے والی سڑک کا حال حکومت کی دیگر سڑکوں جیسا ہو گا۔ سڑک ٹوٹی پھوٹی ہو گی۔ راستہ خراب ہو گا لیکن یہ خدشہ غلط نکلا۔ سڑک بہترین بنی ہوئی ہے۔ ہماری کار ۶۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے چل رہی تھی۔ پھر بھی رفتار کم معلوم ہو رہی تھی۔ ایک جگہ ٹول ٹیکس دینے کے لئے رکنا پڑا۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ یہ سڑک رحمانیہ شوگر ملز کی انتظامیہ نے بنوائی تھی۔ اس سے پہلے سڑک بالکل کچی تھی۔ سڑک کی تعمیر پر ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک کروڑ روپے کی لاگت آئی تھی۔ پختہ سڑک کی وجہ سے اب آمد و رفت میں بہت آسانی ہو گئی ہے۔ اس علاقے کے عوام کو بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ بدین سے آگے چلے تو سڑک کے دونوں کناروں پر کپاس اور گنے کے کھیت نظر آئے جگہ جگہ ہریالی تھی، سبزہ تھا۔ بعض کھیتوں میں کام ہو رہا تھا۔

ایک جگہ کار روکی اور ایک کاشت کار سے بات چیت کی۔

اُس نے بتایا کہ قیام پاکستان سے قبل یہاں اراضی بنجر اور غیر آباد تھی۔ پاکستان بننے کے بعد حکومت نے ملک کو خود کفیل بنانے کے لئے غیر آباد اور نئی سرکاری زمین کو زیر کاشت لانے کا منصوبہ بنایا۔ زیادہ اراضی ایوبی دورِ حکومت میں الاٹ کی گئی۔ زمین کا زیادہ رقبہ فوجی افسروں، سابق فوجیوں، نوکر شاہی کے کل پرزوں کے حصہ میں آیا۔ مقامی بے زمین کسانوں اور ہاریوں کے حصے میں بہت کم اراضی آئی۔ جو اراضی فوجی افسروں اور نوکر شاہی کے حکام کو الاٹ کی گئی وہ انہوں نے ٹھیکہ پر دے دی۔ ان فوجی اور سول وڈیروں کی حیثیت "غیر حاضر زمیندار" کی ہے۔ ان وڈیروں نے مقامی ہاریوں کو زمین ٹھیکے یا بٹائی پر دینے کی بجائے پنجابی کسانوں کو دی۔

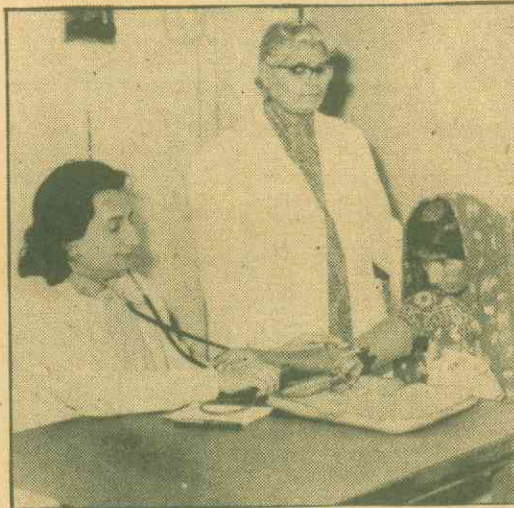
اِس کاشت کار نے بتایا کہ بدین، کھوسکی، جھڈو اوران کے



ملز کے ڈاکٹر انور

گرد و نواح کی زرعی اراضی گنے کے لئے بہت موزوں ہے۔ اس علاقے میں گنا اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے۔ اس علاقہ میں پہلے کوئی شوگر ملز نہیں تھی۔ اِس لئے کاشت کاروں کو اپنی فصل ٹلہار شوگر ملز بھیجی پڑتی تھی۔ جس پر بہت اخراجات ہوتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس علاقہ میں شوگر ملز کے قیام کا مطالبہ کیا۔ یہاں پر زیادہ تر سابق فوجیوں کی زمین ہے۔ اِس لئے انہوں نے جی ایچ کیو سے متعدد بار رجوع کیا یادداشتیں بھیجیں کہ فوجی فاؤنڈیشن یہاں شوگر ملز قائم کریں۔ لیکن جی ایچ۔کیو اور فوجی فاؤنڈیشن کے اربابِ اقتدار نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اِس کے بعد کاشت کاروں نے باوانی خاندان سے رجوع کیا۔ لیکن وہ یہاں سرمایہ کاری کرنے پر رضامند نہ ہوا۔ آخر کار رحمانیہ شوگر ملز کی سابق انتظامیہ نے یہاں پر سرمایہ کاری کی اور پونے دو سال کے عرصہ میں ملز تعمیر ہو گیا۔ اِس کسان نے بتایا کہ ملز کی سابق انتظامیہ سے ہمیں کوئی شکایت نہیں کیونکہ اُسے ملز چلانے کی مہلت ہی نہیں دی گئی۔ ملز کے افتتاح کے ایک ماہ بعد ہی اُسے فوجی فاؤنڈیشن کے حوالے کر دیا گیا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ کاشت کار چاہتے ہیں کہ رحمانیہ شوگر ملز پرانی انتظامیہ کو دیدیا جائے۔ اِس سلسلے میں پیپلز پارٹی کے

تین ڈاکٹروں، ایک لیڈی ڈاکٹر، مڈوائف اور ایمبولینس کا انتظام





غیر شادی شدہ مزدوروں کی رہائش گاہ



مزدوروں کے کوارٹروں کا ایک منظر

سجاول کے چیئرمین اور دیگر سات علاقوں کے چیئرمینوں نے حکومت سے تحریری اپیل کی ہے کہ ملز پرانی انتظامیہ کے حوالے کر دیا جائے۔ کاشت کار نے یہ بھی بتایا کہ پہلے گنے کا نرخ ۴ روپے ۹۰ پیسے فی من تھا۔ اب حکومت نے ۳ روپے ۲۵ پیسے فی من مقرر کیا ہے۔

تقریباً سوا دس بجے ہم رحمانیہ شوگر ملز کھوسکی پہنچے۔ ملز کے جنرل منیجر کرنل (ریٹائرڈ) فضل داد۔ ڈپٹی جنرل منیجر لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) توقیر حسین اور ملز کے چیف اکاؤنٹنٹ موجود نہیں تھے۔ پرسنل منیجر، میجر (ریٹائرڈ) خالد سے ملاقات ہوئی۔ مسٹر خالد کا تقرر یکم اگست سے ہوا ہے۔ اس بہانہ انہوں نے تفصیلات سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے معذرت چاہی۔ دراصل وہ کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ بار بار کہتے تھے کہ جی ایم صاحب نہیں ہیں۔ میں ان کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں بتا سکتا۔ ان کی لاعلمی کا عالم یہ تھا کہ ملز کے مزدوروں کی تعداد تک نہیں معلوم تھی۔ انہوں نے ہمیں ملز دیکھنے کی اجازت بھی نہ دی۔ تصویر تک نہیں اتارنے دی۔ حد تو یہ ہے کہ کینٹین تک بھی جانے نہیں دیا۔ خدشہ تھا کہ مبادا مزدور انہیں اپنے مسائل نہ بتا دیں۔ مسٹر خالد بار بار اپنی مصروفیت اور "رشِ آف ورک" کا ذکر کر رہے تھے۔ ابھی یہ ذکر جاری تھا کہ ملز کے ایک افسر کا ٹیلی فون آیا۔ اس نے برج کھیلنے کی دعوت دی جو مسٹر خالد نے "رش آف ورک" اور دفتری مصروفیت کے باوجود بخوشی قبول کر لی اور ۳ بجے وقت بھی مقرر کر لیا گیا۔ شاید برج کھیلنے کے لئے اُن کے پاس وقت ہوگا۔ اسی دوران میں ایک سابق فوجی آیا، وہ کاشت کار تھا۔ مسٹر خالد اُس سے گفتگو کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ ملز کے جنرل منیجر "غیر حاضر زمیندار" ہیں۔ وہ اپنی اراضی ٹھیکے پر دینا چاہتے تھے اور مسٹر خالد اپنے باس کو خوش کرنے کے لئے یہ سودا کرانا چاہتے تھے۔ دونوں کی گفتگو سے یہ بھی پتہ چلا کہ مسٹر خالد بھی "غیر حاضر زمیندار" ہیں۔ انہوں نے خود اعتراف کیا کہ وہ آج تک کبھی اپنی زمین پر نہیں گئے۔

پھر مسٹر خالد سے ہماری غیر رسمی بات چیت کا سلسلہ چل نکلا۔ انہوں نے بتایا کہ ملز کی روزانہ پیداوار تین ہزار ٹن ہے۔ اور یہ پاکستان کی سب سے بڑی مل ہے۔ ملز کی گنے کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے چالیس ہزار ایکڑ اراضی پر گنے کی کاشت ضروری ہے۔ رحمانیہ شوگر ملز کی سب سے بڑی خصوصیت ریفائنری ہے۔ ریفائن شدہ چینی بعض ادویات میں استعمال ہوتی ہے۔ پاکستان کی دوسری شوگر ملز میں یہ پلانٹ نہیں ہے۔ مسٹر خالد نے ملز کی انتظامیہ کو درپیش مسائل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سابق انتظامیہ نے مزدوروں کی تنخواہیں بہت زیادہ رکھی تھیں۔ قانوناً تنخواہوں میں کمی نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے بہت مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ سابق انتظامیہ نے تنخواہوں کا جو اسکیل مقرر کیا تھا وہ شکر سازی کی صنعت میں سب سے زیادہ تھا۔ انہوں نے بتایا کہ سابق انتظامیہ کینٹین خود چلاتی تھی لیکن ہم نے ٹھیکے پر دیدی ہے۔

پھر مسٹر خالد نے اپنا فلیٹ دکھایا۔ یہ فلیٹ سابق انتظامیہ کا تعمیر کردہ تھا، چار کمرے تھے۔ میز، کرسی، بیڈ، کپڑوں کی الماری کارنر ٹیبل، راؤنڈ ٹیبل، دوسرا فرنیچر تھا اور بجلی کے پنکھے لگے ہوتے تھے۔ مسٹر خالد کے مطابق یہ تمام چیزیں سابق انتظامیہ کی مہیا کردہ تھیں۔ مسٹر خالد کو یہ فلیٹ پسند نہیں اس لئے وہ اپنا زیادہ وقت گیسٹ ہاؤس میں گزارتے ہیں۔ ملز کے موجودہ افسر

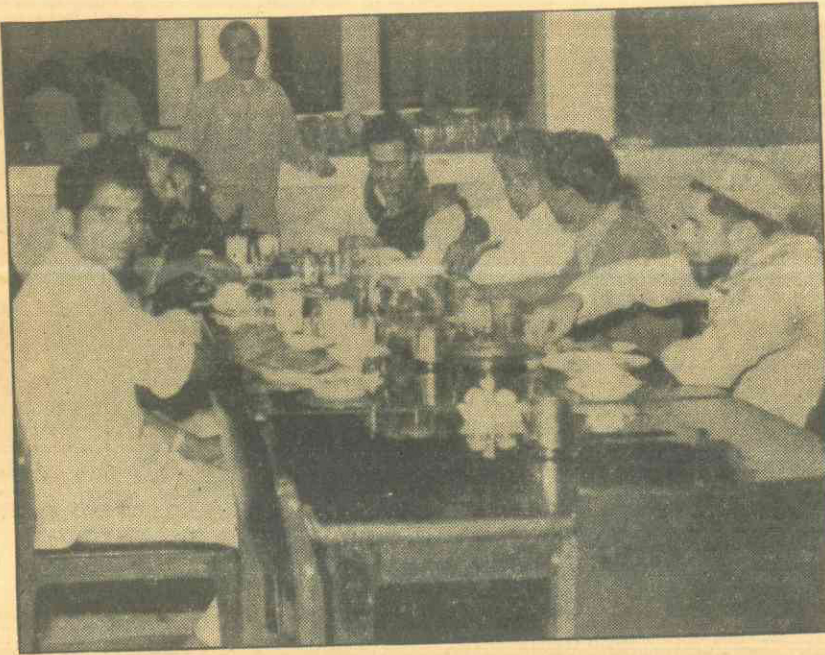
سابق انتظامیہ

مزدوروں کی مائی باپ تھی

فوجی شوگر ملز ایمپلائز یونین ٹنڈو محمد خان کے ایک ذمہ دار رکن نے رحمانیہ شوگر ملز کھوسکی کی موجودہ انتظامیہ اور سابق انتظامیہ کا تقابلی تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ سابق انتظامیہ مزدوروں کی مائی باپ تھی۔ محنت کشوں سے بچوں جیسا سلوک کرتی تھی۔ اُس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اُس نے افسروں اور محنت کشوں کے درمیان حائل دیوار کو گرانے کی کوشش کی تھی بلا امتیاز سب کو ایک جیسی مراعات دی تھیں اور بھائی چارہ کا ماحول پیدا کیا تھا۔ اس لئے رحمانیہ شوگر ملز کے مزدور آج بھی دعا مانگتے ہیں، کہ حکومت دوبارہ ملز سابق انتظامیہ کے حوالے کر دے۔



خون، تھوک اور پیشاب وغیرہ کے معائنہ کی لیبارٹری



فوجی فاؤنڈیشن نے ملز کی کینٹین ٹھیکہ پر دے دی

کھانا بھی اسی گیسٹ ہاؤس میں کھاتے ہیں۔ مسٹر خالد کا بیٹا نیویارک سے آیا تو اُس نے اسی گیسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ مسٹر خالد اعتراضات کے باوجود بار بار کہہ رہے تھے کہ اتنے شاندار گیسٹ ہاؤس کی کیا ضرورت تھی۔ سابق انتظامیہ نے عیاشی کیلئے بنوایا تھا۔ وغیرہ

مسٹر خالد ہمیں گیسٹ ہاؤس دکھانے کے بعد اپنے دفتر چلے گئے۔ اِس کے بعد ہم نے چند مزدوروں سے ملاقات کی۔ ایک مزدور نے بتایا کہ سابق انتظامیہ محنت کشوں کا بہت خیال رکھتی تھی۔ ہم نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ایک مزدور سے آجر کی تعریف سُنی۔ ہمارے خیال میں یہ آجر کی معراج ہے کہ ایک مزدور اُس کی تعریف کرے۔ اُس نے بتایا کہ ملز کی کینٹین کو سابق انتظامیہ خود چلاتی تھی افسروں اور مزدوروں کو ایک ہی قسم کا کھانا ملتا تھا۔ ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھاتے تھے۔ اچھے سے اچھا کھانا ۵۰ پیسے میں مزدور کو دیا جاتا تھا۔ البتہ افسروں سے زیادہ پیسے لئے جاتے تھے۔ جب سابق منیجنگ ڈائریکٹر یہاں ہوتے تو ہمارے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ اسپیشل چائے دس پیسے میں ملتی تھی۔ موجودہ انتظامیہ نے اب کینٹین ٹھیکے پر دیدی ہے۔ کھانے کا معیار دن بدن گرتا جا رہا ہے اور قیمت میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ جو چائے پہلے دس پیسے میں ملتی ہے اب ۲۰ پیسے کی ہو گئی ہے۔

دوسرے محنت کش نے بتایا کہ سابق انتظامیہ نے ہمارے لئے جو کوارٹر تعمیر کرائے ہیں۔ اُن میں میز، کرسی، بیڈ، میں اور بجلی کے پنکھے لگے ہوئے ہیں۔ موجودہ انتظامیہ نے بھی کوارٹر بنوائے ہیں۔ لیکن یہ پہلے کوارٹروں جیسے نہیں ہیں۔ نہ فرنیچر ہے اور نہ بجلی کے پنکھے۔ اس نے کہا کہ سابق انتظامیہ نے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ مزدوروں کے لئے الگ الگ کوارٹر تعمیر کرائے تھے۔ طبی سہولتوں کا ذکر کرتے ہوئے اُس نے کہا کہ سابق انتظامیہ کو ہماری صحت کا بہت خیال تھا۔ اُس نے ملز کا ہسپتال بنوایا جس میں ۵۰ بستر ہیں۔ ہسپتال جدید ترین آلات سے لیس ہے۔ خون، تھوک اور پیشاب وغیرہ کے معائنہ کے لئے ایک لیبارٹری بھی ہے۔ تین ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر، ایک لیڈی ڈاکٹر اور ایک مڈوائف ملازم رکھے گئے۔ مزدوروں کے کوارٹروں کے ہر بلاک میں ایک ٹیلی فون نصب ہے۔ جس کا براہ راست کنکشن ویلفیئر افسر کے دفتر سے ہے تاکہ اگر کوئی ایمرجنسی ہو یا کسی مزدور کے بال بچوں کی طبیعت خراب ہو تو وہ رنگ کر کے ویلفیئر افسر کو مطلع کرے۔

ویلفیئر افسر کا فرض تھا کہ وہ اطلاع ملتے ہی ڈاکٹر کو مزدور کے گھر بھیجے یا ایمبولینس بھیج کر مریض کو ہسپتال بلا لے۔ سابق انتظامیہ نے مزدوروں کے ہر بلاک پر ایک چوکیدار مقرر کیا تھا۔ تاکہ ایمرجنسی کی صورت میں فوری مدد کرے۔ مقصد یہ تھا کہ کارکن یکسوئی، لگن اور محنت سے کام کرے اور اُسے کوئی فکر نہ ہو۔

پھر تعلیمی سہولتوں کا ذکر چلا۔ اس نے بتایا کہ ملز میں ایک پرائمری اسکول ہے۔ بچوں سے فیس نہیں لی جاتی۔ لیکن اب اساتذہ کا کوئی اچھا انتظام نہیں ہے۔ سابق انتظامیہ نے وعدہ کیا تھا کہ مزدوروں کے بچوں کو اعلیٰ درجے تک مفت تعلیم دلائی جائے گی۔ اس نے افسوس کرتے ہوئے کہا کہ اس انتظامیہ کو کام کرنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ ملز کی افتتاح کے ایک ماہ بعد ہی اس پر فوجی فاؤنڈیشن کا قبضہ ہو گیا۔

ہم نے پوچھا کہ جب سابق انتظامیہ محنت کشوں پر اتنی مہربان تھی تو پھر اسے تبدیل کیوں کیا گیا۔ کیا اس نے کوئی بدعنوانی کی تھی؟ جواب ملا، صاحب یہ حکومت کی باتیں ہیں۔ وہی بہتر سمجھ سکتی ہے۔ سابق انتظامیہ نے ہمارے مطالبات کے بغیر ہمیں بہت سی ایسی مراعات دی تھیں جو پاکستان کا کوئی سرمایہ دار نہیں دیتا۔ سابق انتظامیہ نے ہمارے بچوں کی شادی بیاہ کے بارے میں بھی منصوبے بنائے تھے اور فیصلہ کیا تھا کہ مزدور کو اپنی بیٹی کی شادی کے لئے ۱۵ ہزار روپے ملز کی طرف سے دیئے جائیں گے۔ اور اگر کوئی محنت کش کام کرتے ہوئے ہلاک ہو جائے تو اس کی بیوہ کو اس کے شوہر کی تنخواہ کا ۷۵ فیصد بطور گزارہ الاؤنس تاحیات دیا جائے۔ لیکن اب ہمارے یہ خواب منتشر ہو چکے ہیں۔ کیونکہ جس نے وعدہ کیا تھا، یقین دلایا تھا، وہ ہی نہیں رہا۔" اس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "ہمیں تو حیرت ہے کہ جس انتظامیہ سے ہم خوش تھے اسے برطرف کر دیا گیا۔ لیکن جو مالکان چھ چھ ماہ سے محنت کشوں کو تنخواہ نہیں دے رہے ہیں، انھیں حکومت کچھ نہیں کہتی۔ ان کے ملوں پر قبضہ نہیں کیا جا سکتا۔ زیب تن ٹیکسٹائل کا مالک تقریباً سات ماہ سے مزدوروں کو تنخواہ نہیں دے رہا ہے۔ اب حکومت نے اسے گرفتار کر لیا ہے لیکن اس کی ملز پر قبضہ نہیں کیا گیا۔ حالانکہ زیب تن کے مزدوروں نے لکھ کر دیا ہے کہ اگر ملز ہمیں دے دی جائے تو ہم پچاس فیصد زیادہ پیداوار دیں گے۔ صاحب میں تو ان پڑھ آدمی ہوں۔ آپ زیادہ جانتے ہیں۔"

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ سابق انتظامیہ نے زیادہ تر مقامی لوگوں کو ملازم رکھا، صرف انجینئر، اور دیگر ماہرین دوسرے شہروں کے ہیں۔ محنت کشوں کی اکثریت مقامی ہے۔

اس کے بعد ہم فوجی شوگر ملز ٹنڈو محمد خان کے لئے روانہ ہوئے۔ بدین سے حیدرآباد جانے والی سڑک نہایت خراب ہے۔ جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ جگہ جگہ گڑھے ہیں۔ حالانکہ یہ سڑک فوجی نکتہ نظر سے بہت اہم ہے۔ فوج اس سڑک کو استعمال کرتی ہے۔ راستے میں بہت سے فوجی ٹرک بھی ملے۔ سڑک خراب ہونے کی وجہ سے کار دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھی۔ جب ہم فوجی شوگر ملز ٹنڈو محمد خان پہنچے تو ملز میں چھٹی ہو چکی تھی۔ مزدور اپنے گھر جا رہے تھے۔ انتظامیہ کے کسی فرد سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ البتہ

باقی صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ فرمائیں



شاہد کے قلم سے

بلوچستان میں روسی جیمس بانڈ کی پُراسرار سرگرمیاں

مسٹر ڈبلیو کوئٹہ پہنچ گئے جہاں وہ روسی سفارت خانے کے سرمایے سے نیپ کے نام پر اردو کا ایک رسالہ نکالتے ہیں اِس رسالے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں پاکستان سے زیادہ روس اور بھارت کا ذکر ہوتا ہے۔

لیکن جولائی کے مہینے میں مسٹر ڈبلیو کراچی میں تھے اور ہر وقت لالوکھیت اور ناظم آباد کے علاقے میں منڈلاتے نظر آتے تھے۔ لسانی فسادات کی آگ بھڑکنے سے چند روز قبل انہوں نے ایک پیشہ ور طالب علم لیڈر کے مکان میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی۔ یہ مکان ناظم آباد میں واقع ہے۔ یہاں راتوں کو طلبا کا اجتماع ہوتا۔ ان خفیہ جلسوں میں کراچی کا ایک سے ایک بڑا سکّہ بند دادا گیری کرنے والا طالب نظر آتا۔ کسی کی پنڈلیوں پر فٹ ڈاک میں چاقو لگا ہوتا۔ کسی کے نیفے میں دبا ہوتا۔ کوئی پستول سجا کر سج دھج سے آتا۔ کوئی تھرڈ روور یوالور لٹکا کر کاؤبوائے کی طرح داخل ہوتا۔

جلسہ کیا ہوتا دادا گیروں کی پریڈ ہوتی۔ چائے کا دور چلتا۔ چرس کے سگریٹوں پر لمبے لمبے کش لگتے اور دھواں دھار فضا میں دھواں دار تقریریں ہوتیں۔ منصوبے بنائے جاتے کہ کس طرح جماعت اسلامی کے کارندوں کے تعاون سے توڑ پھوڑ کی جائے کیونکر جگہ جگہ آگ لگائی جائے۔ دکانیں لوٹی جائیں، پھر ڈیوٹیاں مقرر کی جاتیں روزانہ کا نقد الاؤنس تقسیم کیا جاتا۔ جن کے پاس اسلحے نہیں تھے ان کے اسلحے مہیا کئے جاتے۔

غرضیکہ یہ خفیہ جلسے رنگ لائے۔ کراچی میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکی تو اس کی لپیٹ میں پورا سندھ آگیا۔ بے گناہ لوگ اِن ہنگاموں میں روز ہلاک ہوتے تھے۔ زخمی ہوتے تھے۔ تباہ ہوتے تھے۔ بے گھر، بے در ہوتے تھے۔ اِدھر یہ تباہی و بربادی تھی اُدھر اپنے اڈے پر ہر رات خفیہ جلسوں میں مسٹر ڈبلیو دادا گیروں کو ان کی کارگزاریوں پر دل کھول کر مبارکباد دیتے۔ کسی کا گھر جلتا، کوئی آگ تاپتا۔

یہ دن بھی عجب دن تھے۔ شہر میں کرفیو لگا تھا۔ لوگ سہمے سہمے، دل گرفتہ اور پریشان نظر آتے۔ لیکن مسٹر ڈبلیو ہنگامہ آرائی کے ہر محاذ پر، ہر مورچے پر نظر آتے۔ چھلاوے کی طرح کبھی یہاں کبھی وہاں۔ وہ ہر مورچے پر جا کر اپنے کارندوں کا دل بڑھاتے۔ ان کی خاطر تواضع کرتے۔ چرس کے سگریٹ بطورِ خاص لاتے اور بڑے اہتمام سے مُسکرا مُسکرا کر پیش کرتے۔

پھر یہ دن بھی نہ رہے۔ ہنگامے سرد پڑ گئے۔ دیوانگی کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ مسٹر ڈبلیو نے بڑا زور مارا مگر کچھ نہ ہوا۔ ہنگامے ختم ہوئے تو دوسرا دور شروع ہوا۔ یہ پکڑ دھکڑ کا دور تھا۔ جگہ جگہ چھاپے پڑے خانہ تلاشیاں ہوئیں۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ محمود الحق عثمانی پکڑے گئے۔ نواب مظفر حسین اور عثمان کینیڈی پکڑے گئے۔ علی محمود معہ اسلحہ پکڑے گئے۔ اسی چکر میں کاظمی اور عبدالباری بھی دھر لئے گئے ویسے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ان دونوں کی گرفتاری غنڈہ ایکٹ میں ہونی چاہیئے تھی۔

جب گرفتاریوں کا سلسلہ طویل ہوا اور پکڑ دھکڑ عام ہوئی تو مسٹر ڈبلیو کو اپنی فکر ہوئی۔ پولیس کی نظروں میں یہ پہلے ہی مشتبہ تھے۔ ان کی پُراسرار سرگرمیوں کی نگرانی ہوتی تھی۔ کئی خطرناک سازشوں میں ان کا نام بھی روزنامچے کے اندر درج ہو چکا تھا۔ انہوں نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو نکل بھاگنے کی ٹھانی۔

ان کے فرار کی داستان بھی کم دلچسپ نہیں۔ یہ بُرقع پہن کر زنانہ بھیس میں رات کو ٹرین سے بھاگے۔ جن لوگوں نے انہیں اس عالم میں کینٹ اسٹیشن پر دیکھا انہیں بے ساختہ ان کے اناڑی پن پر ہنسی آگئی۔ مردانہ شلوار پر اونچی ایڑھی کی سینڈل پہن کر یہ اس انداز سے کمر لچکاتے چلے کہ خواہ مخواہ لوگوں کو شبہ پیدا ہوا کہ یہ تو کوئی ہیجڑا ہے۔ دو ایک تماش بین مسافروں نے آوازے بھی کسے۔ بھونڈے مذاق کیا۔ اِدھر ان کی جان پر بنی تھی۔ سر پر گرفتاری کا خطرہ منڈلاتا تھا۔ غرضیکہ کسی نہ کسی طرح چھپا کے سے ایک کمپارٹمنٹ میں سوار ہوئے اور اس طرح کراچی سے فرار ہو کر کوئٹہ پہنچے۔

مسٹر ڈبلیو کی شخصیت ویسے تو جیمس بانڈ کے ۔ ۔ ۔ کی طرح خاصی پُراسرار ہے۔ مگر جو لوگ انہیں جانتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک زمانے میں وہ روسی سفارت خانے کے شعبہ اطلاعات و نشریات میں مینجر تھے۔ ان دنوں وہ موٹی موٹی روسی میموں کی اردلی میں اکثر نظر آتے تھے۔ ان سے غلط سلط انگریزی میں بات کر کے خوش ہوتے تھے اور خود کو رُوسوف وار ثودسکی کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ مسٹر ڈبلیو کے مختلف نام ہیں۔ ہر دور کے لئے وہ اپنا ایک نیا نام وضع کر لیتے ہیں۔

ایک زمانہ میں وہ امریکی بحریہ کے یانکیوں کے پیچھے مُنہ سے سیٹی بجا کر لپکتے تھے۔ ان دنوں ان کا نام رؤف احمد تھا۔ وہ زمانہ بھی عجیب تھا۔ ان دنوں پاکستان، امریکہ کی ۵۰ ویں یا ۵۲ ویں ریاست کہلاتا تھا۔ اِس دور کے وزیر اعظم محمد علی بوگرہ تھے جو رنگ برنگی بوشرٹیں پہن کر، بغیر کسی حفاظتی دستے کے کراچی کی شاہراہوں پر موٹر سائیکل دوڑاتے پھرتے تھے۔ آئے دن کراچی کے ساحلوں پر امریکی بحریہ کے جہاز لنگر انداز ہوتے۔ اندر سے یانکی قطار اندر قطار نکلتے اور شہر کے گلی کوچوں میں بکھر جاتے۔ اِس زمانے میں "یانکی کمانا" کی اصطلاح بہت عام تھی۔ مطلب اِس کا سیدھا سیدھا یہ تھا کہ یانکیوں کے لئے عیش و عشرت کا سامان مہیا کر کے اپنا کمیشن نقد وصول کرنا۔

دیکھنے والوں نے مسٹر ڈبلیو کا وہ دور بھی دیکھا اور پھر یہ بھی دیکھا کہ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات خراب ہوئے تو مسٹر ڈبلیو راتوں رات انقلابی بن گئے۔ پتلون اور قمیض کو ترک کر کے انہوں نے ٹرنک کے اندر رکھا۔ موٹا کُرتا اور پائجامہ زیب تن کیا۔ بالوں کو بڑھا کر پریشان کیا۔ ذرا شیو بڑھایا اور محنت کشوں کے درد میں مبتلا ہو گئے۔

اِسی بہروپ کے رشتے سے روسی سفارت خانے میں ان کی رسائی ہوئی۔ جب یہ سفارت خانے میں ملازم تھے تو روسیوں کو پاکستان کی مختلف سیاسی پارٹیوں، خصوصیت کے ساتھ غیر ترمیم پسند سیاسی عناصر کے بارے میں معلومات فراہم کرتے تھے۔ اِس کارگزاری کے صلے میں ان کو مترجم کے عہدے سے ترقی دیکر ایک دم منیجر بنا دیا گیا۔

پچھلے سال انہوں نے بہاولپور اور ملتان کا خفیہ سیاسی دورہ کیا تاکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ان علاقوں میں ہوس نواز عناصر پیدا کئے جا سکیں۔ اور وہاں کے مقامی اخبارات کو اسطرح روسی سرمایہ دیا جا سکے کہ وہ اپنی اشاعت جاری رکھتے ہوئے روسی پالیسی کی حمایت میں لکھتے رہیں۔ اس دورے کے دوران مسٹر ڈبلیو نے ملتان اور بہاولپور میں کچھ سیاسی عناصر کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

اس کے بعد وہ ہر ماہ روسی سفارتخانہ کراچی آکر پنجاب کی متحدہ سیاسی پارٹیوں اور غیر ترمیم پسند عناصر کی سرگرمیوں کے بارے میں رپورٹ پیش کرتے ۔ بتایا جاتا ہے، کہ بہاولپور کے دو ہفت روزہ اخبارات اور ایک روزنامہ

نے ان کی وساطت سے روسی سرمایہ حاصل کیا۔

کراچی میں رہتے ہوتے مسٹر ڈبلیو نے روسی سفارت کی مدد سے ایک اردو ماہنامہ بھی جاری کیا

جس پر کراچی کے اخبار "ڈیلی نیوز" نے یہ تبصرہ کیا تھا کہ "اب روسی رسالے پاکستانی ناموں سے چھپنے لگے ہیں۔ کیونکہ اس رسالے میں ۸۵ فیصد مواد روس کی سیاست اور ثقافت کے متعلق ہوتا تھا۔ کراچی کے عوام سفارت خانے کی اس چال کو بھانپ گئے۔ اور اس سے پہلے کہ مسٹر ڈبلیو کو گرفتار کر کے پولیس کے حوالے کر دیا جاتا۔ انہوں نے اس رسالہ کی اشاعت بند کر دی۔

اس رسالے کا ایک سرگرم کارکن یحییٰ نامی ایک شخص تھا جو اس وقت بھی روسی سفارت خانے کا ملازم ہے۔ اس وقت وہ پاک سوویت سوسائٹی کا جنرل سیکرٹری تھا۔ اس دوران مسٹر ڈبلیو نے غیر ترمیم پسند عناصر اور چینی سفارتخانے کے بارے میں بعض معلومات روسی سفارتخانے کو پہنچائیں۔ ایک بار مسٹر ڈبلیو نے خفیہ طور پر چینی سفارت خانہ کی ایک پارٹی میں بھی شرکت کی۔ تاکہ وہاں کی بات چیت روسیوں کو پہنچائی جائیں۔

سب سے بڑا ڈرامہ دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد پیش آیا جب مسٹر ڈبلیو نے روسی پروپیگنڈہ بڑے زور شور سے کیا اور فرضی ناموں سے مراسلے اور مضامین اخبارات میں بھیجے۔

مسٹر ڈبلیو کو روسیوں نے ۵ ہزار روپیہ دے کر پہلے بھی کوئٹہ بھیجا تھا۔ کوئٹہ میں اس وقت صدر بھٹو آنے والے تھے۔

مسٹر ڈبلیو کے بارے میں ڈیلی نیوز نے لکھا کہ "مسٹر ڈبلیو اس وقت کوئٹہ میں تھے جس وقت ایک جلسہ عام میں گولیاں چلائی گئیں۔ ان کو بلوچستان کی اصل صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے روسی سفارتخانے کی طرف سے خصوصی مشن پر روانہ کیا گیا ہے۔" ایک ہفتہ کے قیام کے بعد جب مسٹر ڈبلیو کوئٹہ سے واپس لوٹے تو انھوں نے نیشنل عوامی پارٹی کے بارے میں اور بلوچی عوام کے رجحانات کے بارے میں ایک تحریری رپورٹ پیش کی۔

ان کے قریبی دوستوں کا کہنا ہے کہ مسٹر ڈبلیو کی یہ "رپورٹ" بہت پسند کی گئی اور انھیں روسی سفارت خانے کی طرف سے ایک ہزار روپیہ دیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ روس کے موجودہ قونسل مسٹر بلی ذف نے وہ رپورٹ ماسکو منظوری کے لئے بھیج دی۔ تقریباً ۱۵ دن کے بعد اس کی منظوری آئی۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ روسی سفارت خانے کی جانب سے مسٹر ڈبلیو کو مبلغ ایک لاکھ روپے (پاکستانی کرنسی میں) بمعہ ٹیپ ریکارڈ اور دیگر تمام سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ روسی سفارت خانے نے مسٹر ڈبلیو کو تحریری طور پر یہ بیان دیا ہے کہ خطرے کے وقت وہ جب چاہیں روس جا کر اپنی باقی زندگی گزار سکتے ہیں۔

لاہور کے ایک ہفت روزہ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ مسٹر ڈبلیو اور ان کے پاکستان نما روسی رسالے کا مقصد یہ ہے کہ "ایک طبقے کو دوسرے طبقے سے لڑایا جائے۔ ایک صوبے کو دوسرے صوبے کے خلاف صف آرا کیا جائے۔ اور چھوٹے صوبوں کو "قومی آزادی" کا نعرہ دیکر مرکزی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی ترغیب دی جائے۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے روسی ایجنٹوں کو سرمایہ دھڑا دھڑ فراہم ہو رہا ہے۔"

بقیہ: رحمانیہ شوگر ملز کھوسکی

فوجی شوگر ملز ایمپلائز یونین کے صدر عبداللطیف، جنرل سیکرٹری گل جہاں اور دیگر عہدیدار مل گئے۔ انہوں نے بتایا کہ اس ملز نے ۱۹۶۱ء سے کام کرنا شروع کیا۔ ابتدا ہی سے فوجی فاؤنڈیشن کے قبضے میں ہے۔ یومیہ پیداوار ۲ ہزار بوری ہے۔ اس سال ایک کروڑ تیس لاکھ روپے کا منافع ہوا ہے۔ مزدوروں کی کل تعداد تیرہ سو کے لگ بھگ ہے، ساڑھے چھ سو مستقل ہیں اور ساڑھے چھ سو سیزنل، مسٹر گل جہان نے بتایا کہ اس ملز میں رحمانیہ شوگر ملز کے مزدوروں سے کم تنخواہ ہوتی ہے۔ یہاں کم از کم تنخواہ ایک سو تیس روپے ہے۔ جب کہ حکومت نے کم از کم تنخواہ ۱۴۰ روپے مقرر کی ہے۔ فوجی فاؤنڈیشن کی ملز ہونے کے باوجود یہ حکومت کے احکامات کے مطابق تنخواہ نہیں دے رہی ہے۔

یونین کے جنرل سیکرٹری نے بتایا کہ انتظامیہ وسیع پیمانے پر مزدوروں کی چھانٹی کر رہی ہے۔ ابھی حال ہی میں کیمیکل ڈیپارٹمنٹ سے ۱۷ محنت کشوں کو برطرف کر دیا گیا حالانکہ اس شعبہ میں مزید توسیع کی گئی ہے۔ یہی عمل دوسرے شعبوں میں جاری ہے۔ مزدوروں کی تعداد میں دن بدن کمی کی جارہی ہے۔ اور افسروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پہلے صرف تین شفٹ انجینئر تھے اب آٹھ کر دیئے گئے ہیں۔

یونین کے صدر نے طبی سہولتوں کی کمیابی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ملز نے ہول ٹائم ڈاکٹر کا تقرر نہیں کیا گیا ہے۔ ایک جزو وقتی ڈاکٹر ہے۔ جو ایک گھنٹے صبح ایک گھنٹے شام کو ہسپتال میں بیٹھتا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر کوئی نہیں ہے۔ ہم نے ہسپتال دیکھا وہاں ادویات کی کل گیارہ بوتلیں تھیں۔ ان وارڈ مریضوں کے لئے ۱۲ فٹ لمبا، اور دس فٹ چوڑا صرف ایک کمرہ ہے۔ جس میں تین بستر لگے ہوئے تھے۔ ملز کا اسکول مڈل تک ہے۔ لیکن پڑھائی کا معیار بہت پست ہے۔ اس لئے محنت کش اپنے بچوں کو پڑھنے کے لئے شہر بھیجتے ہیں۔ یونین کے ایک عہدیدار نے بتایا کہ ہم نے ملز کی انتظامیہ سے متعدد بار درخواست کی کہ محنت کشوں کے بچوں کے لئے ایک اسکول بس کا انتظام کیا جائے۔ یا ایک ٹرک دیا جائے جس میں بیٹھنے کا انتظام مزدور اپنے اخراجات سے کر لیں گے۔ مگر انتظامیہ نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔ جب کہ انتظامیہ کے افسروں کے بچے حیدرآباد پڑھنے جاتے ہیں۔ ان کے لئے ملز کی جانب سے اسکول بس کا انتظام ہے۔

گل جہاں نے بتایا کہ کینٹین کی حالت انتہائی خراب ہے۔ اور کھانا بہت مہنگا ہونے کے باوجود نہایت ناقص اور خراب ہوتا ہے۔ سادہ چائے دس پیسے اور اسپیشل چائے ۲۲ پیسے میں ملتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ملز کی انتظامیہ دعویٰ تو کرتی ہے کہ وہ اسے کسی نفع نقصان کے بغیر چلاتی ہے۔ لیکن یہ دعویٰ سراسر غلط ہے۔

رہائشی سہولتوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مزدوروں کے لئے ۱۱۸ کوارٹر ہیں، غیر شادی شدہ مزدوروں کے لئے پانچ بیرکس ہیں۔ لیکن کالونی کی صفائی کا کوئی انتظام نہیں۔ کھیل کے میدان بھی نہیں ہیں۔ نہ کلب ہے۔ نہ جانے ویلفیئر فنڈ کہاں خرچ کیا جاتا ہے۔

ایک مزدور نے شکایت کی کہ فوجی فاؤنڈیشن والے مقامی مزدوروں کو ملازم نہیں رکھتے۔ حالانکہ اس علاقے میں بے روزگاری بہت زیادہ ہے۔ ہر روز بے شمار مزدور ملازمت کی تلاش میں آتے ہیں۔ لیکن انھیں کورا جواب ملتا ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ فوجی فاؤنڈیشن بتائے کہ فوجی شوگر ملز ٹنڈو محمد خاں میں کتنے مقامی مزدور ہیں۔

اس سفر میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ الطاف رانا فوجی شوگر ملز ٹنڈو محمد خان کے بیت الخلا میں گئے۔ غلاظت کی بھرمار تھی، معلوم ہوتا تھا کہ کئی دنوں سے صاف نہیں کیا گیا، اسلئے رانا کا پاؤں پھسل گیا اور جوتے غلاظت سے اتنے بھر گئے کہ دھونے کے باوجود بو آرہی تھی۔ لہٰذا جوتوں کو کار کی ڈگی میں رکھ دیا۔ راستے بھر الطاف رانا کا موڈ خراب رہا ہے بار بار کہتے کہ میرا نیا جوتا خراب ہو گیا

یہ کالم ہر مہینے ممتاز فلم ساز، ہدایت کار ضیا سرحدی آپ کے لئے لکھا کریں گے



فلم حادثاتی طور پر قابض ہونے والے وڈیروں کی جاگیر نہیں

ضیاء سرحدی

طویل عرصہ کے بعد امید ہوئی تھی کہ پچھلے مہینے ضیاء محی الدین شو میں شمولیت کا جو دعوت نامہ مجھے ملا ہے وہ پاکستانی فلم کی بدحالی پر کھل کر گفتگو کرنے کا پروانہ ہوگا۔ اور اسی بہانے سے ضیا محی الدین اور اسکے شو کے شرکار کے ساتھ اس سنگین مسئلہ پر میں بھی بلا تکلف اپنے خیالات کا اظہار کر سکوں گا، لیکن یہ امید رائیگاں ثابت ہوئی، اور وہ یوں کہ ضیاء محی الدین نے اپنے اس متعلقہ شو کی ترتیب، وقت کی تقسیم اور مناسب لوگوں کی شرکت کے معاملہ میں مسئلہ فلم کو بقدرِ ضرورت اہمیت نہیں دی۔ اور نتیجتہً یہ شو دیگر اور غیر متعلقہ مضامین کی نذر ہو گیا یہی نہیں بلکہ سٹیج پر داخل ہونے اور پردہ اٹھنے سے پہلے میرے کان میں یہ بھی ڈال دیا گیا کہ گفتگو کے دوران مذاح اور ناظرین کے ہنسنے ہنسانے کا خیال مجھ کو بھی خاص طور پر رکھنا ہوگا۔ اب ان ہدایات کے پیشِ نظر ظاہر ہے کہ میں دفعتاً کشمکش و پیچ میں گرفتار ہونے لگا۔ اور جس سنجیدہ مضمون پر میں سنجیدگی سے بات چیت کرنے کا ارادہ کر کے پہنچا تھا وہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ میں تو یہ توقع لیکر گیا تھا کہ ضیاء محی الدین کا پہلا سوال ہی ہمارے فلم کی بدحالی، گمراہی اور اس کی غیر ذمہ دارانہ روش کے بارے میں ہوگا۔ اور یہیں سے گفتگو، مناسب اور دل خواہ منازل کی طرف بڑھے گی۔ لیکن موصوف کے پہلے جملے نے ہی گفتگو کی ایسی ڈگر کا تعین کر دیا کہ جس سے فلم پر جامع اور بھرپور تبادلہ خیال کی گنجائش خاصی حد تک کم ہو گئی اور نہ صرف یہ بلکہ دیگر شرکار کی آمد کے بعد تو موضوعِ سخن ہی بدلنا شروع ہو گیا۔ اور فلم کے وقت اور غور طلب مسئلہ سے ہٹ کے، بات کدھر سے کدھر چلی گئی۔ اور دیکھتے دیکھتے ہم لوگ موسیقی کی سرشت اور رقص کے مخصوص فنی تقاضوں اور ان کی دیگر باریکیوں میں الجھ کے رہ گئے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اس شو میں تمام تر گفتگو اور بحث کا موضوع فلم کو رکھا جاتا۔ اور موسیقی اور رقص کے مسائل کو بھی اسی حد تک زیرِ غور رکھا جاتا جس حد تک ان فنون کا بالواسطہ فلم سے تعلق ہے مگر یہ نہ ہوا۔

بہرحال، "الفتح" کے اس شمارے سے فلم کے لیے چند اوراق مخصوص کر دیئے گئے ہیں اور میرے نزدیک یہ اقدام اس لیے بھی قابلِ تحسین ہے کہ "الفتح" کے توسط سے (جو ایک فکر انگیز جریدہ بھی سمجھا جا سکتا ہے) فلم کے مسئلہ پر مقابلتاً زیادہ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ غور و فکر کیا جا سکتا ہے۔

فلم ایک اہم سوشل مسئلہ ہے۔ اپنی عالمگیر مانگ، گرفت ترغیب اور اثر کے پیشِ نظر اس کو سطحی نظر سے قطعاً نہیں دیکھا جا سکتا۔ اور ہماری موجودہ فلمیں، جن اخلاقی، فنی اور شعوری تقاضوں سے افسوسناک حد تک منحرف ہو چکی ہیں اور جو زہر یہ اگل رہی ہیں ان کا دفاع نہ صرف فلم سے متعلق لوگوں پر واجب ہو جاتا ہے بلکہ حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ اس آجلے ہمہ گیر اور بصیرت افروز فن کو، وہ لوگ بھی پراگندہ اور غلیظ ہونے سے بچائیں جن کا بظاہر فلم سے کوئی ڈائریکٹ اور پیشہ ورانہ تعلق نہیں ہے۔ فلم صرف ان وڈیروں کی جاگیر نہیں ہے جو حادثاتی طور پر اس پر قابض ہیں اور اس کی عنان کو بزورِ زر پکڑے ہوئے ہیں۔ عام شہریوں، ناقدوں اور فلم کے دیگر خیر خواہوں کے علاوہ حکومت کو بھی۔ اس ضمن میں مثبت اور نتیجہ خیز اقدامات کرنے ہوں گے۔ مناسب تجاویز اور تدابیر اب تو اس لیے بھی، نہایت ضروری سمجھی جا سکتی ہیں جب کہ ہمارے ملک میں، واضح طور پر، انقلابی شعور کا ایک فیصلہ کن دور شروع ہونے لگا ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ آیا ہمارا فلم بھی بالآخر اپنا مناسب قومی کردار ادا کرے گا یا نہیں۔ عوام کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے خود کو اس طرح سے ہم آہنگ کرے گا یا نہیں جس سے ہمارے موجودہ دور کے تاریخی تقاضے پورے ہو سکیں۔

اپنے طور پر میں فلم کو اولاً تین اہم افکار پر مشتمل سمجھتا ہوں۔

(۱) فلم کا مجموعی معاشرتی زاویۂ فکر

(۲) انقلابی رشتۂ فکر

(۳) اور فلم کا مخصوص فنی طرزِ فکر

ان تین نکات کے پیشِ نظر ہماری فلم آج کل نہ کسی مثبت معاشرتی زاویۂ فکر کی حامل ہے اور نہ اس میں انقلاب کا کوئی چراغ روشن نظر آتا ہے۔ اور نہ ہی اپنے مخصوص فنی لوازمات اور جمالیات کے اعتبار سے اس میں کوئی وزن ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ ان تمام خامیوں اور پس ماندگیوں کی ذمہ داری کن پر عائد ہوتی ہے۔ اول و آخر ہماری فلمی بدحالی کا سرچشمہ ہماری فلم کا وہ "وڈیرائی" ذہن ہے جو نہ صرف اپنے زرگرانہ رجحانات ہی کا شکار ہے بلکہ اس کی ناقابلِ قبول قدامت پسندی اور دقیانوسی فکری استطاعت بھی اس سلسلہ میں خاصا نفرت انگیز کردار ادا کرتی رہی ہے۔

نئے فلمی فکر و نظر، انقلابی فلمی فکر و نظر، قومی فلمی

فکر و نظر کا آغاز کیسے ہوگا، کون کرے گا اور کب ہوگا؟ ان سوالات کا جواب کون دے گا اور نئے پاکستان میں نئے فلم کی تشکیل کون کرے گا؟ ظاہر ہے کہ یہ پرانے رجعت پسند اور محدود ذہنوں کے بس کی بات نہیں، یہ کام چربہ ساز، تن آسان اور زر پرست فلم ساز نہیں کر سکتا۔ یہ کام ہمارے وہ گلیمر زدہ، جنس خوردہ اور سطحیت پرست فلم ساز بھی نہیں کر سکتے جن کی فلمیں ہرزہ گوئی، نفس پرستی، خودنمائی اور گھٹیا قسم کی دہرائی ہوئی عشق بازی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتیں۔

ان کرم خوردہ ذہنوں سے نجات کسی انقلابی جدوجہد کے نتیجے ہی میں مضمر ہے۔

ہم کو ایسی ڈگر پر اگر چلنا ہے تو ہم کو کرانومیت طارقیت اور اسی طرح کی دوسری افسوسناک راہوں سے ہٹ کے پوڈوکن، آئزن سٹین، گرفتھ، ڈی سیکا، فیلنی ستیہ جیت رائے اور اسی قسم کے انقلابی کردار کے حامل دیگر فرانسیسی، چینی، جاپانی اور امریکی فلمسازوں کے تخلیقی انداز کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اور ان لوگوں سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔

بقیہ: فتویٰ بازعلماء

اس مقام پر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ تمام انسانی تحریریں خواہ وہ کسی نوعیت کی ہوں تعلیم رکھتی ہیں علم نہیں، وہ اس لیے کہ وہ دوسروں کے اقوال ہوتے ہیں۔ اور کوئی قول بھی اس وقت تک علم کا درجہ نہیں پا سکتا۔ جب تک وہ مشاہدہ اور تجربہ کی تائید حاصل نہ کر لے اس لحاظ سے دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے مثلِ شمع اپنے آپ کو پگھلانا حصولِ علم کی اولین شرط ہے جو صاحب جبّہ و دستار ذاتی اغراض کے لیے مادی وسائل پر حریصانہ نظر رکھتا ہو اور اپنی ضروریات کی کفالت کے لیے خدا کو کافی نہ سمجھتا ہو۔ اس سے ہمیشہ علم گریزاں ہی رہتا ہے اسے فنون میں تو یدِطولیٰ حاصل ہو سکتا ہے، علم میں نہیں!

لہٰذا ایسے لوگوں کا عالم کہلا کر دوسروں کے ایمان، عزّت اور جان کے متعلق فیصلے دینا کسی طرح مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ معاشرہ کے نظم و انصرام کو قائم رکھنا بہت اچھی بات ہے لیکن اس کے نام پر سنگدلی اور بے رحمی کے ان مظاہروں کو دین کا جزو بنانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جو تعصّب، پست فکری، تنگ نظری، ذاتی اغراض اور محض اپنی بات کو بالا رکھنے کے لیے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔

یہ سب باتیں نہ تو خدا اور اس کے رسولؐ کے منشأ میں داخل ہیں اور نہ انہیں جائز ہی سمجھا جا سکتا ہے اس سے دین بدنام ہوتا ہے۔ اس کی برکات پھیلتی نہیں صاحبانِ مسجد و مکتب کے دلوں میں عدم گداز سے بے برکتی عام ہو گئی ہے ؎

دلِ مُلّاؔ گرفتارِ غمے نیست
نگاہش ہست در چشمش نمے نیست

بقیہ: سکّے کی قیمت میں کمی

قیمتوں میں ۵ گنے سے زیادہ فرق ہو گیا ہے۔ اور اس تمام فرق کا فائدہ سامراجی طاقتوں کو ملے گا اور نقصان پاکستان کے محنت کش عوام اٹھائیں گے۔ سکّے کی قیمت میں کمی کی وجہ سے پاکستان پر سامراجیوں کا استحصال فوری طور پر پانچ گنا زیادہ بڑھ گیا ہے اور پاکستان کے معاشی حالات پانچ گنا زیادہ بدتر ہو گئے ہیں۔

۳۔ سکے کی قیمت میں کمی کی وجہ سے سامراجی قرضوں کی ادائیگی میں بھی پاکستان کا زبردست نقصان ہوا ہے۔ اس سال سامراجیوں کو ۶ کروڑ ڈالر کی رقم قرضوں کی ادائیگی میں دینا تھی۔ سکّے کی قیمت میں کمی سے پہلے ۶ کروڑ ڈالر ۲۸ کروڑ پچاس لاکھ روپے کے برابر تھے یعنی سکے کی قیمت میں کمی سے پہلے پاکستان کو قرضے کی ادائیگی کے لئے ۲۸ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے ادا کرنا تھے لیکن اب ۶۹ کروڑ روپے ادا کرنا ہیں۔

۴۔ بین الاقوامی سطح پر پاکستانی مال کی قیمت کم ہونے کی وجہ سے پاکستانی مزدوروں کی قوتِ محنت میں بھی اسی تناسب سے کمی ہو گئی ہے۔

۵۔ سامراجی اور سرمایہ دار ملکوں سے تمام تجارتی لین دین، قرضوں کی ادائیگی، قرضوں پر سود کی ادائیگی۔ سامراجی ملکوں کو منافع کا بھیجنا یہ سب کا سب ڈالر میں ہوتا ہے۔ ڈالر کمانے کا واحد ذریعہ پاکستانی برآمدات ہے۔ جب کہ برآمدات میں اضافہ مشکل ہی سے ہوگا۔ وہ ڈالر جن کی ضرورت ہے اور وہ ڈالر جو مہیا ہو سکیں گے اُن کے درمیان دو گنے سے زیادہ فرق پڑ گیا ہے۔ اس فرق کو ختم کرنے کے لئے اور زیادہ سامراجی قرضے لینا پڑیں گے اور پاکستان پر سامراج کا تسلّط اور زیادہ شدید ہو جائے گا۔

۶۔ برآمدات کو بڑھانے اور برآمدات بنانے والی صنعتوں کو بڑھانے کا رجحان سطحی اور یک طرفہ اقدامات کو جنم دے گا اور ملک کی منڈی کے لئے مال یا تو بڑھے گا نہیں یا کم بڑھے گا۔ اس طرح سے اشیائے صرف کے میدان میں سامراجی ممالک سے درآمدات میں اضافہ ہوگا۔ اگر ہم حکومت کی موجودہ پالیسی کو دیکھیں جس میں درآمدات پر پابندیاں ختم کر دی ہیں تو یہ بات اور زیادہ صاف نظر آئے گی۔

۷۔ ہمارے عوام کی قوتِ خرید میں کمی ہو جائے گی اور ملک کی منڈی میں قیمتوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔

۸۔ اس تمام کے نتیجے میں ہماری معاشیات کا بحران اور زیادہ شدید ہو جائے گا اور طبقاتی جدوجہد میں ہمیشہ سے زیادہ اضافہ ہوگا۔

اس لئے یہ بالکل واضح ہے کہ محض اپنی موجودہ معاشی صورتِ حال کو برقرار رکھنے کے لئے پاکستان کے برسرِ اقتدار طبقوں کے لئے از حد ضروری ہے کہ ملک کی مجموعی سماجی پیداوار کی مقدار کو جوان کے پاس ہے بہت ہی زیادہ بڑھایا جائے لیکن ایک نیم نوآبادیاتی، جاگیردارانہ سماج میں پیداواری قوتوں کا فروغ اور پیداوار میں کسی حد تک اضافہ ناممکن ہوتا ہے۔ لہٰذا ہماری سماجی دولت کے براہِ راست حاصل، پرولتاریہ اور کسانوں کے استحصال کو اور زیادہ شدید کر کے پاکستان کے برسرِ اقتدار طبقے اپنے سامراجی آقاؤں کے مطالبات اور حقوق کو پورا کر سکتے ہیں۔

اس قسم کی صورتِ حال میں تمام استحصالی طبقے یہی طریقے استعمال کرتے ہیں کہ ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا جائے اور مزدور اور کسان کی آمدنی کی قیمت میں کمی کر دی جائے رجعت پسند تشدّد کے ذریعے (عوام کی مزاحمت کو کچلنے اور ہڑتالوں پر پابندی لگانے کے ذریعے) اجرتوں میں کمی کر دی جائے۔ ٹرانسپورٹ، صحت، بجلی، پانی وغیرہ پر سرکاری اخراجات کم کر دیئے جائیں۔ چاہے اس سے عوام اور زیادہ مصائب کا شکار ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

یہاں پر یہ بھی ذکر کرنا ضروری ہے کہ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اس قسم کی "امداد" منظور کرنے سے پہلے جو موجودہ حکومت نے حاصل کی ہے، امداد دی جانے والی حکومتوں سے معاشی اور سیاسی اقدامات کی ضمانت طلب کر لیتی ہے۔ ان اقدامات کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جب کوئی دیکھے کہ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور امریکی حکومت میں کتنا قریبی تعلق ہے اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ فاشی حکومتوں مثلاً برازیل اور یونان کی کس قدر مدد کرتا ہے۔

سکّے کی قیمت میں کمی کرنے کی پالیسی بناتے وقت حکومتِ پاکستان نے سامراجیوں اور استحصالی طبقوں کے مفادات کے تحفظ پر پوری توجہ دی ہے۔ درآمدات پر ڈیوٹی کم کر دی ہے اور بہت سی اشیاء پر پابندیاں ختم کر دی ہیں اور اس طرح سے تجارتی اور صنعتی سرمایہ دار کو موقعہ دیا ہے کہ وہ اپنا استحصال اب سے زیادہ بڑے پیمانے پر جاری رکھ سکیں۔

اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کی کرنسی کی زرِ مبادلہ کی شرح میں کمی کے نتیجے میں بہت زیادہ منافع کی ضمانت کی وجہ سے یہ پہلے سے کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں مزید سامراجی سرمایہ کاری ہوگی اور اس کے ساتھ ساتھ اسی مناسبت سے پاکستان میں سامراجی تسلّط بھی بڑھے گا۔

Regd. No : S- /2
Weekly "Al - Fatah" Karachi
31 August — 7 September. 1972

